فہرستِ مضامین

بصائر و عبر

روزہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا نشان!	۳	محمد اعجاز مصطفیٰ

مقالات و مضامین

مسجد: امتِ مسلمہ کے نشاط اور روحانی وفکری رہنمائی کا مرکز	۱۰	حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ
رؤیتِ ہلال	۱۸	مفتی عبدالستار حامد
برقی تصویر (چوتھی قسط)	۲۵	مفتی شعیب عالم
قدیم اور جدید معاشی نظریات کا تعارف (آخری قسط)	۳۶	مفتی عارف محمود
الرزاق جل جلالہ	۴۲	ڈاکٹر محمد اشرف کھوکھر
کچھ تذکرہ عید اور اعمالِ عید کا	۴۹	مفتی محمد راشد ڈسکوی

یادِ رفتگاں

آہ! میرے دوست حکیم محمد اخترؒ	۵۶	جناب نثار احمد خاں فتحی

دار الافتاء

چاندی اور دیگر دھاتوں کی انگوٹھی پہننے کا حکم	۶۰	ادارہ

نقد و نظر

	۶۳	ادارہ

وإقامِ الصلوٰۃ وإیتاءِ الزکوٰۃ والحجِ وصومِ رمضان‘‘۔ (متفق علیہ،مشکوٰۃ،ص:۱۲)

ترجمہ:’’اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اوراس کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا اور حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا‘‘۔

مختصر یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کی برکت سے اس امت کو رمضان جیسا ماہِ عظیم، ماہِ مبارک، ماہِ صبر اور ماہِ مواساۃ عطا فرمایا، جس میں تھوڑی سی بدنی مشقت یعنی سحری سے لے کر غروب آفتاب تک عبادت کی نیت سے کھانے، پینے اور جنسی خواہشات سے اپنے آپ کو روک لینے پر اللہ تعالیٰ نے اُنہیں بہت سے انعامات، برکات، ہدایا اور عطایا سے نوازا ہے، مثلاً: رزق کی زیادتی، گناہوں سے مغفرت، جہنم سے آزادی، جنت کا حصول، روزے دار کی منہ کی بُو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک وعنبر سے زیادہ پسندیدہ ہونا، سارا دن مچھلیوں کا ان کے لیے استغفار کرنا، جنت کا ان کے لیے سجایا جانا، سرکش شیاطین کا قید کیا جانا، رمضان کی آخری رات میں روزہ داروں کی مغفرت کیا جانا، اللہ تبارک وتعالیٰ کا روزے دار کی طرف متوجہ ہونا اور اپنی رحمت خاصہ کا نزول فرمانا، اللہ تعالیٰ کا خطاؤں کو معاف فرمانا، روزے داروں کی دعاؤں کا قبول ہونا، اللہ تعالیٰ کا اپنے روزے دار بندوں کی وجہ سے ملائکہ پر فخر فرمانا، روزے کا گناہوں اور جہنم سے ڈھال بننا، رمضان میں ایک نفل کا ثواب فرض کے برابر اور ایک فرض کا ثواب عام دنوں کے اعتبار سے ستر فرائض کے برابر ہونا، اسی طرح عام عبادات میں ایک عمل کا ثواب دس گنا سے لے کر سات سو تک اور خاص طور پر شب قدر کی عبادت کا ثواب ہزار مہینوں سے افضل اور زائد ملنا۔ لیکن روزے کے لیے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا اور دوسری روایت میں ہے کہ میں خود روزے کی جزا ہوں، یعنی میں روزے دار کا بن جاتا ہوں، اب وہ جو چاہے گا میں اس کو عطا کروں گا۔ ایک حدیث میں ہے:

’’ وروی عن أبی سعید الخدری رضی اللّٰہ عنہ قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ: إذا کان أول لیلۃ من رمضانَ فُتِحَتْ أبوابُ السماء، فلا یُغْلَقُ منہا بابٌ حتیٰ یکون آخرُ لیلۃ من رمضان، ولیس عبدٌ مؤمنٌ یصلی فی لیلۃٍ فیہا إلا کتب اللّٰہ لہٗ ألفاً وخمسَ مائۃ حسنۃ بکل سجدۃٍ وبنیٰ لہ بیتاً فی الجنۃ من یاقوتۃٍ حمراءَ لہا ستون ألفَ بابٍ لکل بابٍ منہا قصرٌ من ذہبٍ موشحٌ بیاقوتۃٍ حمراءَ، فإذا صام أولَ یومٍ من رمضانَ غُفِرَلہٗ ماتقدم من ذنبہٖ إلٰی مثل ذلک الیوم من شہر رمضان، واستغفر لہ کلَّ یوم سبعون ألفَ ملکٍ

روزہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا نشان!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کومٹی سے بنا کر اشرف المخلوقات کا لقب دیا۔ سوچنے اور سمجھنے کے لیے اُسے عقل وشعور کی نعمت سے نوازا۔ دیکھنے، سننے، چکھنے، سونگھنے اور لذت وتکلیف محسوس کرنے کے لیے حواسِ خمسہ جیسے اعضاء سے مزین کیا۔ راہِ حق دکھانے اور بتانے کے لیے انبیاء کرام علیہم السلام کا عظیم الشان سلسلہ جاری فرمایا، اُنہیں آیاتِ بینات اور معجزات سے مالا مال کیا۔ انبیاء ورسل علیہم السلام نے اولادِ آدم کو ان کے خالق ومالک کی بندگی اور اطاعت کی طرف بلایا۔ جن بندگانِ الٰہی نے ان داعیانِ الی اللہ کی دعوت پر لبیک کہی اور اُسے قبول کیا، خالق کائنات نے اُنہیں سعادت مندی اور نجاتِ ابدی کا پروانہ عطا کیا اور جن افراد نے ان کی دعوت سے سرتابی کی اور طغیان وعصیان کا مظاہرہ کیا، رب ذوالجلال نے انہیں راندۂ درگاہ اور عتاب وعقاب کا نمونہ بنادیا۔

سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے مبعوث فرمایا، قرآن کریم جیسی لاریب اور عظیم کتاب کو آپ ﷺ پر نازل فرمایا، آپ ﷺ کی شریعت کو آخری شریعت بنایا۔ آپ ﷺ نے اپنی امت کو سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی توحید اور اپنی رسالت کی دعوت دی، جن لوگوں نے کلمۂ توحید اور آپ ﷺ کی رسالت کو قبول کیا، اُنہیں نماز کی دعوت دی گئی۔ اس کے بعد زکوۃ، حج اور رمضان کے روزہ کی فرضیت نازل ہوئی اور ان پانچوں چیزوں کو اسلام کی بنیاد اور اساس قرار دیا گیا، جیسا کہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

’’بنی الإسلام علیٰ خمس: شهادةِ أن لا إلٰه إلا اللّٰه وأن محمداً عبدهٗ ورسولهٗ

من صلاۃ الغداۃ إلیٰ أن توَاریٰ بالحجاب، وکان لہ بکل سجدۃٍ یسجدھا فی شھر رمضان بلیل أو نھارٍ شجرۃٌ یسیر الراکب فی ظلھا خمسَ مائۃِ عامٍ." (الترغیب والترھیب، ج:۲،ص:۹۳،۹۴، ط:دار إحیاء التراث العربی)

ترجمہ:...''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب رمضان کی پہلی رات ہوتی ہے تو آسمان کے تمام دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، پھر ان میں سے کوئی دروازہ آخر رمضان تک بند نہیں کیا جاتا، اور جو مومن بندہ اس (رمضان) کی رات میں نماز پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر سجدہ کے بدلہ میں پندرہ سو نیکیاں عطا فرماتے ہیں اور اس کے لیے جنت میں سُرخ یاقوت کا ایک گھر بناتے ہیں، جس کے ساٹھ ہزار دروازے ہوتے ہیں، ان میں سے ہر دروازے کا (کے اندر) ایک سونے کا محل ہے جو سرخ یاقوت سے مزین کیا گیا ہے، پھر (مومن بندہ) جب رمضان کے پہلے دن روزہ رکھتا ہے تو اُس کے گزشتہ گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں اور ہر دن فجر کی نماز سے سورج غروب ہونے تک ستر ہزار فرشتے اس کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہیں اور رمضان میں خواہ دن ہو یا رات وہ جو بھی سجدہ کرتا ہے، اس کے بدلہ میں اس کے لیے (جنت میں) ایک ایسا درخت لگ جاتا ہے جس کے سائے کے نیچے ایک گھڑ سوار پانچ سو سال تک دوڑ سکتا ہے''۔

اسی طرح روزے دار کو دو خوشیوں کا ملنا: ایک افطار کے وقت کی خوشی کہ اللہ تعالیٰ نے روزے جیسی عظیم عبادت کی توفیق عطا فرمائی اور ایک خوشی اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے وقت ہوگی، ان شاء اللہ!

اسی طرح روزہ داروں کے لیے جنت کے بابِ ریان کا مخصوص ہونا، جنت میں شرابِ طہور کا ملنا، جس کے پینے کے بعد کبھی پیاس نہیں لگے گی، روزہ رکھنے سے صحت کا ملنا، روزہ کا روزے دار کے لیے قیامت کے دن سفارش کرنا، خیر کے کام کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کے منادی کی طرف سے مزید اعمالِ خیر کی ترغیب دینا، رمضان کی پہلی رات میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا اپنے بندوں پر نظر رحمت کرنا اور جس پر اللہ تعالیٰ کی نظر رحمت ہوگئی، اس کو کبھی عذاب کا نہ ملنا، ہر دن دس لاکھ لوگوں کا جہنم سے آزاد ہونا اور ایک روایت میں ساٹھ ہزار کا آزاد ہونا اور رمضان کی آخری رات میں پورے مہینے کے برابر آزاد شدہ لوگوں کی تعداد کے برابر لوگوں کا جہنم سے آزاد کیا جانا، رب العالمین کا فرشتوں سے ان کے اجر کے بارہ میں دریافت کرنا اور فرشتوں کو ان روزہ داروں کی بخشش پر گواہ بنانا، آسمان کے دروازوں کا کھلنا، رمضان کی ہر رات میں اللہ تعالیٰ کے منادی کا

اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ ندا دینا کہ ’’ہے کوئی سوال کرنے والا کہ میں اس کا سوال پورا کروں؟ ہے کوئی اپنے گناہوں سے توبہ کرنے والا کہ میں اس کی توبہ قبول کروں؟ ہے کوئی بخشش مانگنے والا کہ میں اس کو بخشش دوں؟ ہے کوئی دعا کرنے والا کہ میں اس کی دعا قبول کروں؟‘‘ شب قدر میں فرشتوں کا عبادت میں مصروف لوگوں سے مصافحہ کرنا، ان کی دعاؤں پر فرشتوں کا آمین کہنا، ہر رات دن میں روزہ دار کی ایک دعا کا قبول ہونا۔ یہ تمام وہ انعامات ہیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ روزہ رکھنے والوں کو روزہ کی بنا پر عطا فرماتے ہیں۔

روزہ رکھنے کی بنا پر اتنے انعامات ملنے کے باوجود اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہل ایمان کو روزہ کی فرضیت کے بارہ میں بڑے محبانہ، شفیقانہ اور حکیمانہ انداز میں فرمایا:

’’یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ‘‘. (البقرۃ:۱۸۳)

ترجمہ:.. ’’اے ایمان والو! فرض کیا گیا تم پر روزہ جیسے فرض کیا گیا تھا تم سے اگلوں پر تاکہ تم پرہیزگار ہوجاؤ‘‘۔

یعنی یہ روزہ صرف تم پر فرض نہیں ہوا، بلکہ تم سے پہلے لوگوں پر بھی فرض کیا گیا اور یہ روزہ اس لیے فرض کیا گیا، تاکہ تم متقی بن جاؤ اور یہ چند دنوں کی بات ہے، لیکن اس میں بھی مریض اور مسافر کو اجازت ہے کہ وہ بعد میں اس کی قضا کرسکتے ہیں اور جو لوگ روزہ کی طاقت نہیں رکھتے، بڑھاپے وغیرہ کی بنا پر وہ فدیہ دے دیا کریں۔ یہ کتنا شفقت، محبت اور پیار بھرا انداز اور خطاب ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندوں کے لیے اختیار فرمارہے ہیں۔ روزے کے روحانی وجسمانی فوائد اور اس کی حکمتیں بیان کرتے ہوئے حضرت مولانا سید زوّار حسین شاہ صاحب نوراللہ مرقدہٗ رقم طراز ہیں:

’’روزہ رکھنے میں بہت سی حکمتیں اور فوائد ہیں، جن سے روزہ کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے، ایک حکمت یہ ہے کہ روزہ رکھنے سے انسان کو اپنی عاجزی اور مسکینی اور خدا تعالیٰ کی عظمت وجلال اور اس کی قدرت کاملہ پر نظر پڑتی ہے اور اس سے بندگی اور فرمانبرداری کی صفت پیدا ہوتی ہے۔ روزہ کی برکت سے چشم بصیرت کھلتی ہے اور دین کی سمجھ میں ترقی ہوتی ہے، روزہ کی حالت میں فرشتوں کی صفاتِ ملکیہ سے متصف ہوتا ہے اور اس کی برکت سے انسان کو ملائکہ الٰہی کے ساتھ قرب حاصل ہوتا ہے۔ روزہ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی شکرگزاری کا موقع ملتا ہے، درندگی اور چوپایوں والی صفت سے دوری حاصل

ہوتی اور انسانی ہمدردی کا جذبہ دل میں پیدا ہوتا ہے، کیونکہ جب تک کسی شخص نے بھوک اور پیاس کی تکلیف کو محسوس ہی نہ کیا ہو، وہ بھوکوں اور پیاسوں کے حال سے کس طرح واقف ہوسکتا ہے؟ ....جو شخص بھوک اور پیاس کی مشقت سے واقف نہ ہو، وہ رزاق مطلق کی نعمتوں کا شکر حقیقی طور پر ادا نہیں کرسکتا، اگرچہ زبان سے شکر کے الفاظ ادا کرتا رہے۔ جب تک کسی کے معدہ میں بھوک اور پیاس کا اثر اور اس کے رگ وریشہ میں ضعف وناتوانی کا احساس نہ ہو، اس کو اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کی قدر نہیں ہوتی، جو اس کی بھوک اور پیاس کو دور کرتی اور کمزوری کو زائل کرتی ہیں، اسی لیے وہ ان خداوندی نعمتوں کا کما حقہ شکر بھی ادا نہیں کرسکتا۔ روزہ انسان کے لیے ایک روحانی غذا ہے، جو دوسرے جہاں یعنی آخرت میں انسان کو ایک غذا کا کام دے گا۔ جن لوگوں نے اس دنیا میں روزے نہیں رکھے، وہ اس جہاں میں بھوکے پیاسے ہوں گے اور ان پر آخرت میں روحانی افلاس ظاہر ہوگا، کیونکہ انہوں نے اپنے ساتھ اپنا زادِ راہ نہیں لیا۔ روزہ کی اہمیت یہ بھی ہے کہ یہ بلغمی امراض اور رطوباتِ فُضلیہ کو جسم سے زائل کردیتا ہے۔ روزہ میں صبر اور برداشت کرنے کی عادت ہوجاتی ہے۔ ریگستان یا بیابانی سفر میں اگر اتفاق سے غذا یا پانی میسر نہ آئے تو روزہ کا عادی شخص اس فاقہ کو برداشت کرسکتا ہے، بخلاف زیادہ کھانے والے شخص کے جو فاقہ کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کرکے تھوڑے عرصہ میں موت کے منہ میں پہنچ جاتا ہے۔ ......ان سب مصلحتوں اور حکمتوں کے باوجود روزہ کی ایک بہت بڑی اہمیت اور ایک خاص حکمت یہ ہے کہ روزہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا ایک بہت بڑا نشان ہے، جس طرح کوئی شخص کسی کی محبت میں سرشار ہوکر کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے اور میاں بیوی کے تعلقات بھی اس کو بھول جاتے ہیں، اسی طرح روزہ دار بھی اللہ تعالیٰ کی محبت میں سرشار ہوکر اسی حالت کا اظہار کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوائے کسی اور کے لیے روزہ رکھنا جائز نہیں ہے‘‘۔ (مقالاتِ زرّاریہ،ص:۱۴۰،۱۴۱)

مسلمانوں کو چاہیئے کہ ان ایام کی قدر کریں، اخلاص اور محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لیے روزہ رکھیں، روزہ کو جھوٹی باتوں، تمام گناہوں اور ریاکاری سے محفوظ رکھیں، ورنہ روزے کے

ثواب سے محرومی کا سامنا کرنا پڑے گا، جیسا کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ’’کتنے روزہ رکھنے والے ایسے ہیں کہ جنہیں سوائے بھوکا پیاسا رہنے کے کچھ حاصل نہ ہوگا اور کتنے قیام کرنے والے ایسے ہیں کہ سوائے مشقت کے انہیں کچھ حاصل نہ ہوگا‘‘۔اسی طرح آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

” من صام رمضان وعرف حدودهٔ وتحفظ مما ينبغي له أن يتحفظ كَفَّرَ ماقبله.

رواه ابن حبان فی صحيحه والبيهقی“. (الترغیب والترھیب، ج:۲،ص:۵۵،ط:دار احیاء التراث العربی)

یعنی جس نے رمضان کا روزہ رکھا اور اس کی حدود کو پہچانا اور روزوں کا ہر اعتبار سے تحفظ کیا، اللہ تبارک وتعالیٰ ایسے روزہ کو گزشتہ گناہوں کے لیے کفارہ بنادیں گے۔

مسلمان خواہ مرد ہوں یا عورتیں بغیر عذرِ شرعی کے کسی روزہ کی قضا نہ کریں، اس لیے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”من أفطر يوماً من رمضان من غير رخصة ولامرض لم يقض عنه صوم الدهر كله وإن صامه“. (مشکوٰۃ،ص:۱۷۷)

یعنی جس نے رمضان کا ایک روزہ بغیر کسی رخصت اور بیماری کے چھوڑ دیا، ساری زندگی وہ روزے رکھتا رہے، اس ایک روزہ کا ثواب اسے نہیں مل سکتا۔

روزہ خواہ فرض ہو یا نفل، اس میں کوئی ایسی خاص بات تو ضرور ہے نا! کہ جس کی بنا پر آپ ﷺ بار بار اس کی تاکید فرمارہے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس کے مثل اور اس کے برابر کوئی عبادت نہیں، جیسا کہ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی ایسا عمل بتلائیے کہ جس کی بنا پر مجھے جنت کا داخلہ مل جائے۔آپ ﷺ نے فرمایا: روزوں کو لازم پکڑو، اس کے برابر کوئی عمل نہیں ہوسکتا۔صحابیؓ فرماتے ہیں: میں نے دوبارہ، سہ بارہ یہی سوال کیا، آپ ﷺ نے ہر مرتبہ یہی فرمایا کہ: روزوں کو لازم پکڑو، اس کے برابر کوئی عمل نہیں ہوسکتا۔حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے اس پر ایسا عمل کرکے دکھایا کہ رمضان کے فرض روزوں کی بجاآوری تو کرتے ہی تھے، لیکن نفلی روزوں کا بھی ساری زندگی ایسا اہتمام کیا کہ کہا جاتا ہے: ان کے گھر سے دن کو کبھی بھی دھواں اُٹھتا ہوا نظر نہیں آیا، سوائے ان دنوں کے جب کہ کوئی مہمان ان کے گھر میں آجاتا۔

اسی لیے فرمایا گیا کہ رمضان المبارک کی برکتوں اور رحمتوں سے جو محروم رہا، وہ تمام خوبیوں اور بھلائیوں سے محروم رہا۔

رمضان المبارک کو قرآن کریم کے ساتھ ایک خاص تعلق ہے، ہر مسلمان کو چاہئے کہ

رمضان المبارک میں زیادہ سے زیادہ قرآن کریم کی تلاوت کرے، دعاؤں کا اہتمام کیا جائے ، صدقہ وخیرات کی کثرت کی جائے ، اپنے ملازم اور نوکروں سے کام میں تخفیف کی جائے ، لا إلٰہ إلا اللّٰہ کا ورد رکھا جائے ، استغفار کا معمول بنایا جائے ، جنت کی طلب ہو اور جہنم سے آزادی کی دعائیں کی جائیں ۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں رمضان المبارک جیسے سعید لمحات واوقات عبادت میں گزارنے اور اس کے تمام انعامات، برکات اور فضائل حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے ، آمین ۔

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیرِ خلقہٖ سیدِنا محمدٍ وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ أجمعین

اعتذار وتصحیح

ماہنامہ بینات شعبان المعظم ۱۴۳۴ھ کے شمارہ میں ’’عالم ربانی کی رحلت‘‘ کے عنوان سے حضرت مولانا حکیم محمد اختر نور اللہ مرقدہٗ کے حالات میں لکھا گیا تھا کہ آپؒ مولانا شاہ محمد احمد پرتاب گڑھی قدس سرہٗ اور حضرت مولانا شاہ عبد الغنی پھولپوری برد اللہ مضجعہ کے خلیفہ مجاز تھے، حالانکہ صحیح یہ ہے کہ آپؒ حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے سلسلے کے ایک بزرگ حضرت مولانا شاہ محمد احمد پرتاب گڑھیؒ کے تربیت یافتہ، حضرت مولانا عبد الغنی پھولپوریؒ کے مسترشد، شاگرد رشید اور فیض یافتہ اور حضرت شاہ ابرار الحق ہردوئی نور اللہ مرقدہٗ کے خلیفہ مجاز تھے۔ یہ غلطی اس اخباری بیان سے لگی جو حضرت حکیم صاحبؒ کے وصال کے اگلے دن اخبارات میں شائع ہوا۔ بعض قارئین بینات نے اس سہو پر توجہ دلائی، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔ قارئین بینات سے التماس ہے کہ وہ اس کی تصحیح فرمالیں۔

مسجد: امتِ مسلمہ کے نشاط اور روحانی وفکری رہنمائی کا مرکز

حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ
اُردو ترجمہ وترتیب: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

محدث العصر حضرت بنوریؒ نے یہ وقیع مقالہ رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے منعقد کی گئی کانفرنس ''مؤتمر رسالة المسجد'' کے لیے عربی زبان میں تحریر فرمایا تھا، یہ کانفرنس رمضان المبارک ۱۳۹۵ھ مطابق ستمبر ۱۹۷۵ء میں پانچ روز جاری رہی۔ موضوع کی مناسبت سے حضرت بنوریؒ نے اس مقالہ میں مسجد کی اہمیت وفضیلت کے ساتھ ساتھ امام وخطیب کی ذمہ داری کو بھی اجاگر فرمایا۔ عنوان کی اہمیت کے پیش نظر اس مقالہ کا اُردو ترجمہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

الحمد للّٰہ الذی جعل المساجدَ لإعلاء کلمةِ اللّٰہ وإقامةِ التوحید ، والصلاةُ والسلامُ علی سیدنا محمدٍ خَاتَمِ النبیین الذی بنی المساجدَ أساساً لفلاحٍ وخیرٍ و إرشادِ العبید، وعلی آلہٖ وصحبہٖ الذین شَیَّدُوا معالمَ التوحید ، ورفعوا رأیاتِ مجدِ الإسلام ؛ فخاب کلُّ جبار عنید ، أمّا بعد :

شریعت اسلامیہ کا یہ حسن ہے کہ اس کا پیش کردہ ہر نظام جس مرتب انداز پر اُستوار ہے، وہ خوبی وکمال کی اتنی نوعیتیں اپنے اندر سمویا ہوا ہے کہ انسانی عقل اس کے پیش کردہ نظام سے بہتر اور مکمل نظام کا تصور بھی نہیں کرسکتی، پس پنجگانہ نمازیں جو امت پر روزانہ فرض ہیں، بلا شبہ ایسی عبادت ہے جو خالص اللہ کی رضا کے لیے ہے۔ ان نمازوں کے مکمل ثمرات اور عمدہ برکات عظیم اجروثواب کی صورت میں تو جنت میں ہی ملیں گی، جہاں کی نعمتیں بےمثل و بےنظیر ہیں۔ ہر نماز کے لیے اذان جیسے عظیم الشان مسنون عمل کے ذریعے لوگوں کو جمع کرنے کا حسین طریقہ مقرر کیا گیا، پھر ان نمازوں کے لیے خاص جگہیں ہیں، جن کا نام مساجد رکھا گیا۔ یومیہ پانچ مرتبہ لوگوں کے اس طرح جمع ہونے سے جہاں امتِ مسلمہ کے روحانی اجتماع کا باعث بنا، وہیں اس کے ذریعے باہمی تعارف، الفت ومحبت، اور افرادِ امت کو ایک دوسرے سے قریب ہونے کا موقع بھی فراہم کیا گیا۔

پھر محلّہ کی مسجد میں ہونے والے اس پنج وقتہ اجتماع کے دائرے کو جامع مسجد کے ذریعے مزید وسعت دی گئی۔ شکرانے اور خوشی کے دو تہواروں یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے لیے کھلے میدان میں باجماعت نماز کا اجتماع مقرر کرکے اس دائرے کو مزید کشادہ کیا گیا، اور پھر ان تمام اجتماعات سے بڑھ کر حج بیت اللہ کا اجتماع مقرر کیا گیا۔ اگر امتِ مسلمہ کی جانب سے کما حقہ قدردانی ہو تو شریعت کا عطا کردہ ہر نظام مسلمانوں میں دینی، اجتماعی اور ثقافتی روح بیدار کرنے کا بہترین ذریعہ ہے، اور اہل اسلام کو قدردانی پر آمادہ کرنا چنداں مشکل نہیں۔ یہ مقصد ترغیب وترہیب، وعظ ونصیحت اور قدردانی کرنے والوں کے اجرِ عظیم کا بار بار تذکرہ کرکے حاصل کیا جاسکتا ہے، اور اس طرح شوق دلا کر اگر لوگوں کو عمل پر آمادہ کیا جائے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ جو شخص ان حقائق کو اچھی طرح جانتا اور سمجھتا ہو اور بلند کردار کا طالب ہو، وہ اُسے جاننے کے بعد بھی احکام اسلام کی پاسداری نہ کرے۔ جماعت کے ساتھ نماز کی ادائیگی کے لیے ان بابرکت مساجد کا نظام وہ نظام ہے کہ انسانی عقل اس سے ارفع اور بہتر نظام کو سوچ ہی نہیں سکتی۔

اس نظام کی مندرجہ ذیل بنیادی خصوصیات ملاحظہ کیجیے:

توحید، رسالت، آخرت اور نماز کی طرف دعوت

ایک شخص ایک سے زائد مرتبہ اللہ کی عظمت وجلالت اور اللہ کی توحید بیان کرتا ہے، اور حضور ﷺ کی نبوت ورسالت کا اعلان کرتا ہے، پھر لوگوں کو نماز کی دعوت دیتا ہے جو ہر قسم کی ہدایت اور بھلائی کا منبع ہے، پھر اسی طرح اخروی کامیابی کی دعوت بھی دیتا ہے، اور بقول علامہ راغب اصفہانیؒ کے جس کامیابی کی بقاء کو فنا کا، جہاں کی مالداری کو فقر کا، اور جہاں ملنے والی عزت کو ذلت کا کوئی اندیشہ نہیں، وہاں کا علم ہر جہل سے مبرا ہے۔ (المفردات فی غریب القرآن، مادہ: فلح، ص:۳۸۵، المطبعۃ المیمنیۃ، مصر)

اس پر مزید اضافہ کیجیے کہ وہاں کی راحت میں تکان کا گزر نہیں۔ اس جامع اور انوکھی دعوت کو دیکھیے، پھر یہ بھی ذہن میں رہے کہ اس آواز کو مسلمانوں کے گوش گزار کرنے کے لیے منارا ور منبر جیسے وسائل کا انتخاب کیا گیا، جن میں آج کی سائنسی پیش رفت کے بعد لاؤڈ اسپیکر اور مائیک کا بھی اضافہ ہو چکا ہے۔ اس اہمیت کے ساتھ مسجد میں آنے کی دعوت خود ایک عجیب شان رکھتی ہے۔

مسجد کی اہمیت قرآن کریم کی روشنی میں

قرآن کریم کی وہ آیات جن کا مسجد اور اس کے بنیادی اہداف ومقاصد کے بیان سے تعلق ہے، وہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مساجد توحید خداوندی اور اسلام کی دعوت کے مراکز ہیں، اور دین میں اخلاص پیدا کرنے کا سرچشمہ ہیں، نیز ان کی آبادی اللہ کے ذکر، نماز اور عبادت سے ہوتی ہے، باری جل شانہٗ کا ارشاد ہے:

’’وَأَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ أَحَداً‘‘۔ (الجن:۱۸)
’’اور یہ کہ مسجدیں اللہ کی یاد کے واسطے ہیں، سومت پکارو اللہ کے ساتھ کسی کو‘‘۔(ترجمہ شیخ الہندؒ)
یہ آیت مسجد میں توحید کا پرچار کرنے اور مساجد کو ہر نوع کے شرک سے دور رکھنے کی ہدایت کرتی ہے۔
باری جل شانہٗ کا ایک اور فرمان ہے:
’’وَأَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ‘‘۔(الاعراف:۲۹)
’’اور سیدھے کرو اپنے منہ ہر نماز کے وقت اور پکارو اس کو خالص اس کے فرمانبردار ہوکر‘‘۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)
یہ ارشاد مساجد میں اخلاص کے ساتھ عبادت کرنے اور اخلاص کے منافی ہر عمل سے بچنے کی ہدایت دیتا ہے۔
باری جل شانہٗ کا ایک اور فرمان ہے:
’’فِیْ بُیُوْتٍ أَذِنَ اللّٰهُ أَنْ تُرْفَعَ وَیُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ‘‘۔ (النور:۳۶)
’’ان گھروں میں کہ اللہ نے حکم دیا ان کو بلند کرنے کا‘‘۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)
جمہور مفسرین کی رائے کے مطابق یہ آیت مساجد کے مقاصد کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

مسجد کے فضائل واہمیت احادیث رسول ﷺ کی روشنی میں

مزید براں فضائل پر نظر ڈالیں: مساجد کی طرف پیش قدمی کے لیے اُٹھنے والے ہر قدم کے بدلے ایک درجے کی بلندی اور ایک خطا کی معافی کا وعدہ کیا گیا، ہر صبح وشام مسجد کی طرف جانے کے بدلے جنت میں صبح وشام کی خاص مہمان نوازی کا اعلان کیا گیا، جیسا کہ صحیح حدیث میں منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’جو شخص مسجد کی طرف صبح کے وقت، یا شام کے وقت جاتا ہے، اللہ جل شانہٗ اس کے لیے جنت میں ہر صبح اور ہر شام مہمان نوازی فرمائیں گے۔
(صحیح البخاری، کتاب الصلوۃ، باب فضل من خرج الی المسجد ومن راح،۱/۹۱، ط: قدیمی)
اسی طرح صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کے مطابق جب کوئی شخص مسجد میں داخل ہوتا ہے تو جب تک وہ اپنے مصلے پر باوضو رہے فرشتے اس کے لیے یوں دعا کرتے رہتے ہیں: ’’اے اللہ! اس کی مغفرت فرما، اے اللہ! اس پر رحم فرما‘‘۔
(صحیح البخاری، کتاب الصلوۃ، باب من جلس فی المسجد ینتظر الصلوۃ وفضل المساجد،۱/۹۰، ط: قدیمی)
آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ’’جب تم جنت کے باغوں سے گزرو تو خوب چرو، سوال کیا گیا کہ: جنت کے باغ کیا ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مساجد‘‘۔(سنن الترمذی، ابواب الدعوات، باب،۲/۱۹۱، ط: قدیمی)
اسی طرح مساجد کی تقدیس وتعظیم، اسلام میں مساجد کی بلند شان اور مسجد میں داخل ہونے

والے شخص کے لیے ثواب اور اجرِ عظیم کی بشارتوں کے سلسلے میں کئی روایات منقول ہیں۔

مسجد، کتاب وسنت کی تعلیم وتربیت کا مرکز

اسلام کی عظیم الشان تاریخ ہمیں مسجد نبوی میں حضور ﷺ کی حین حیات قائم ہونے والے دینی تعلیم کے حلقوں کا پتہ دیتی ہے، یہ تاریخ ہمیں بتلاتی ہے کہ فقراء اصحابِ صفہؓ حضور ﷺ کے کلام مقدس کو سننے اور یاد کرنے کے لیے جمع ہونے والا پہلا قافلۂ علم تھا۔ یہ حضرات مسجد نبوی اور صفہ ہی میں رہتے، تاکہ قرآن کی کوئی آیت جو بصورتِ وحی آپ ﷺ پر نازل ہو یا آپ ﷺ کا اپنا کوئی فرمان گرامی سننے سے رہ نہ جائے۔ ان میں وہ قراء کرام بھی تھے جنہیں بئر معونہ پر رعل، ذکوان اور عصیہ نامی قبائل کے افراد نے دھوکہ سے شہید کیا، اور آپ ﷺ نے ان قبائل کے خلاف ایک مہینے تک فجر کی نماز میں قنوتِ نازلہ کے ذریعے بددعا فرمائی۔ انہی اصحاب صفہؓ میں وہ لوگ بھی تھے جن کے بارے میں حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ: ''میں نے اصحاب صفہؓ میں سے ستر افراد ایسے دیکھے ہیں کہ ان میں سے کسی کے پاس تن ڈھانکنے کے لیے مکمل کپڑا نہ ہوتا تھا، یا ازار ہوتی یا بڑی چادر ہوتی جس کو گردن پر باندھ لیتے، کسی کی یہ چادر نصف پنڈلی تک پہنچتی، کسی کی ٹخنوں تک پہنچتی، تو وہ اس چادر کو سمیٹ سمیٹ کر بیٹھ جاتے، مبادا ستر ظاہر ہو جائے۔ (صحیح البخاری، کتاب الصلوۃ، باب نوم الرجال فی المسجد، ۱/۶۳، ط: قدیمی)

انہی اصحاب صفہؓ میں سے جو نبی کریم ﷺ کے شاگرد تھے، ایک انتہائی باکمال اور باصلاحیت عبقری شخصیت حضرت ابوہریرہؓ کی تھی، آپؓ کا شمار حفاظِ حدیث صحابہؓ میں ہوتا تھا۔ عہد نبوت کے صرف تین سالوں میں آپؓ نے علوم حدیث کے وہ عظیم خزانے حاصل کیے جن کی کثرت نے ایک عالم کو انگشت بدنداں کر دیا، آپؓ کی نبی کریم ﷺ سے روایت کردہ احادیث جو ہم تک پہنچی ہیں، ان کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر (۵۳۷۴) ہے، یہ ایک بڑی تعداد ہے اور ''صحیح بخاری'' کی مکررات کو حذف کر کے بقیہ روایات سے زیادہ ہے۔

صرف مسجد نبوی اور مسجد حرام ہی کیا، دنیا میں جہاں کہیں بصرہ، کوفہ، بغداد، شام، وغیرہ ممالک فتح ہوئے تو وہاں مساجد کی تعمیر عمل میں آئی۔ یہ مساجد بھی درس وتدریس کے مراکز تھے، یہ مراکز بڑی بڑی جامع مساجد میں قائم تھے، گویا علم کے چشمے تھے جو اُبل پڑے تھے اور فراوانی سے بہہ رہے تھے۔ عراق کی فتح کے بعد جامع مسجد کوفہ سب سے پہلی مسجد تھی، جس کی بنیاد حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے رکھی تھی، یہ مسجد احادیث نبویہ کی تعلیم کا مرکز تھی، جہاں براء بن عازبؓ پہلے صحابی تھے جنہوں نے احادیث نبویہ کی تعلیم شروع فرمائی۔ اسی طرح بعد کے ادوار میں بھی مساجد دین کی درسگاہیں ہی ہوا کرتی تھیں، ان میں سب سے زیادہ شہرت قاہرہ کی جامع ازہر، تیونس کی جامع زیتونہ اور اندلس کی جامع قرطبہ کو حاصل ہوئی۔ ان کے علاوہ بھی کئی ایسی جامع مساجد تھیں جو کہ علوم اسلامیہ کی باقاعدہ

یونیورسٹیاں تھیں، جن سے علم کے چشمے جاری تھے، جن سے نکلنے والی نہریں کرۂ ارض کے مختلف گوشوں میں پھیل چکی تھیں، اور ان نہروں سے چھوٹے بڑے سبھی اہل علم مستفید ہو رہے تھے۔ ان تاریخی روایات کو مدنظر رکھ کر یہ بات بجا طور پر کہی جاسکتی ہے کہ اسلامی سلطنت وسطوت کے زمانے میں عرب و عجم کے جس شہر میں بھی کوئی مسجد قائم ہوئی، وہ کتاب وسنت کی تعلیم کا مرکز بھی رہی ہے۔

ان مبارک تاریخی نقوش کی روشنی میں اب ہم قارئین و حاضرین، ائمہ وخطبا کی خدمت میں مساجد کے لیے چند اصول وضوابط پیش کرتے ہیں، تاکہ پنج وقتہ نماز کے لیے مسجد میں آنے والا ہر شخص شریعت کے نظامِ مساجد سے فائدہ اٹھا سکے۔

امام مسجد کے اوصاف

۱- ہر مسجد کے لیے ایک سمجھ دار، بیدار مغز، فاضل عالم دین بطور امام مقرر کیا جائے۔

۲- جو نمازیوں کی اچھی طرح تربیت اور انہیں دینی تعلیم سے روشناس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

۳- نیز یہ امام قرآن کریم کو درست تجوید کے ساتھ پڑھنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہو۔

۴- اور اچھے اخلاق سے بھی آراستہ ہو۔

اِمام درسِ قرآن کی تیاری کس طرح کرے؟

۱- ہر امام کو چاہیے کہ وہ نماز فجر کے بعد درس قرآن کا سلسلہ شروع کرے۔

۲- جس میں نمازیوں کو قرآن کریم کے مطالب اس اسلوب سے ذہن نشین کروائے جو ان کے فہم اور مستویٰ کے مطابق ہو۔

۳- ایسی باتیں جو ان کے لیے کارآمد نہ ہوں، مثلاً: لغت، اعراب وترکیب کی باریکیاں، یا بے فائدہ توجیہات وتاویلات، وغیرہ میں ہرگز نہ پڑے۔

۴- بلکہ قرآن کریم کے اہم پہلوؤں پر اکتفا کرتے ہوئے قرآن کریم کے مطالب و مقاصد کو عمدہ اور نفع منداسلوب کے ساتھ واضح کرے، کیونکہ امت کے آخری لوگوں کی اصلاح کا بھی وہی طریقہ ہے جو طریقہ اول امت کی اصلاح کے لیے نبی کریم ﷺ نے اختیار فرمایا تھا۔

۵- امام کو چاہیے کہ درس کے دوران آیات کے ترجمہ وتفسیر کی مناسبت سے نمازیوں کے عقائد کی درستگی، اور ان کے معاملات کی اصلاح کی طرف بھی بھرپور توجہ کرے۔

۶- درس کے لیے مختصر وقت مقرر کیا جائے، یہ وقت کم سے کم پندرہ منٹ اور زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹہ ہو، تاکہ عوام کو اُکتاہٹ نہ ہو، اور درس میں شرکت کی پابندی ہو سکے، اس لیے کہ بہترین عمل وہی ہے جو ہمیشگی اور مستقل مزاجی سے کیا جائے، اگرچہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔

درسِ حدیث کا اہتمام اور اس کی تیاری

۱- مناسب ہے کہ عشاء کی نماز کے بعد درس حدیث کا اہتمام کیا جائے۔

۲- درس حدیث کے لیے عمدہ اور مفید کتب مثلاً: امام نوویؒ کی ''**ریاض الصالحین**'' یا امام منذریؒ کی ''**الترغیب والترھیب**'' کا انتخاب ہو۔

۳- اس درس میں ان اختلافی مسائل کا تذکرہ جس سے نمازیوں کو فکری تشویش لاحق ہو، نہ کیا جائے۔

۴- درس حدیث کا بنیادی ہدف نمازیوں کی روحانی اصلاح اور ان کے دل و دماغ کی پاکیزگی کی کوشش ہو۔

۵- اس درس کا وقت کم از کم آدھا گھنٹہ مقرر کیا جائے، اور فجر کے بعد کا وقت اس کے لیے مناسب ہے، اس لیے کہ یہ فراغت وفرصت کا وقت ہوتا ہے۔

۶- اس طرز پر تعلیمی سلسلے جاری رکھنے کی صورت میں ہر مسجد ایک دینی مدرسے کی صورت اختیار کرلے گی۔

عام فہم اسلامی فقہی احکام سے متعلق نصاب

۱- ایک خاص نصاب مقرر کیا جائے، جس میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، وغیرہ بنیادی عبادات کے فقہی احکام کا انتخاب ہو۔

۲- فجر کے علاوہ چاروں نمازوں میں سے کسی ایک نماز میں کم از کم پانچ منٹ اس نصاب کی تعلیم کے لیے متعین کیے جائیں، تاکہ نمازیوں کو ان عبادات کے احکام سے بھی ایک گونہ واقفیت ہوجائے۔

خطبۂ جمعہ اور تقریر کی تیاری

۱- جامع مسجد جہاں جمعہ وعیدین کی نمازیں بھی ادا کی جاتی ہوں، وہاں کے خطیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے خطبے میں عالمی اسلامی مسائل کو لے کر امت مسلمہ کی حالیہ ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن وسنت کی روشنی میں بات کرے۔

۲- اسی طرح خطیب کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اس خطبے کو اچھی طرح تیار کرے، ایسے الفاظ کا چناؤ کرے جو اصلاح قلب کے لیے مؤثر اور مفید ہوں۔

۳- نیز خطبہ معتدل انداز کا ہو، نہ اس قدر اختصار ہو کہ مقصود حاصل نہ ہوسکے، نہ موضوع سے ہٹ کر غیر ضروری باتوں کی تطویل ہو کہ سننے والے اُکتا ہی جائیں۔

۴- یہ بھی خیال رہے کہ خطبے میں ایسے اختلافی مسائل کو نہ چھیڑا جائے جو امت میں عرصہ دراز سے اختلافی ہی چلے آرہے ہیں۔

۵-خطیب کو چاہیے کہ وہ اہمیت کے حامل فقہی احکام اور دین کے بنیادی مسائل کے بیان ہی پر اکتفا کرے۔

۶-خطیب کی دعوت ایسی حکیمانہ ہو کہ سننے والوں کے دلوں کو چھو جائے۔

۷-ساتھ ساتھ کتاب وسنت کے دلائل سے مؤید بھی ہو، تاکہ سامعین مطمئن رہیں، اور یہ سمجھ سکیں کے دین اسلام ہی وہ آسمانی مذہب ہے جو انسان کی نیک بختی اور سعادت کا ضامن ہے، یہی وہ دین فطرت ہے جس سے انسان کا بنایا ہوا کوئی نظام مستغنی نہیں ہوسکتا، اور امریکی و یورپی تہذیب کی کجی اور بگاڑ کی اصلاح صرف اور صرف صحیح اسلام اور شریعت محمدیہ پر عمل کرنے ہی میں ہے۔ دین اسلام ہی سب سے بہتر دینی و اقتصادی نظام ہے، جو فرد و جماعت، مادی و روحانی تمام شعبہ جات کو حاوی ہے۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے خطیب ان موضوعات کا انتخاب کرے جو معاصر ضرورتوں میں سے اہمیت کے حامل ہوں۔

جمعہ کا خطبہ مسنونہ غیر عربی زبان میں بدعت اور فتنہ ہے

اگر سامعین عربی زبان جاننے والے نہ ہوں تو ان کے لیے مناسب یہ ہے کہ خطبۂ جمعہ بلکہ اذان سے پہلے خطبے کے موضوع کو سامعین کی زبان میں بطور خلاصہ پیش کر دیا جائے۔ جمعے کا خطبہ صرف عربی زبان ہی میں دیا جائے، اس لیے کہ عہد نبوی ہی سے امت کا یہ معمول رہا ہے کہ جمعہ وعیدین کے خطبے عربی زبان ہی میں دیے جاتے رہے ہیں، اس لیے کہ عربی زبان قرآن اور اسلام کی زبان ہے، غیر عربی زبان میں خطبہ کسی صورت مناسب نہیں، اس لیے کہ عہد صحابہؓ میں فارس و روم کے علاقے جب فتح ہوئے تھے، اس وقت بھی خطبۂ جمعہ کی زبان عربی ہی رہی۔ اسی طرح تمام خطبات کی اصل روح باری عز اسمہ کا ذکر ہے، جہاں تک خطبے کے ذریعے وعظ ونصیحت کی بات ہے تو وہ ثانوی چیز ہے، یہی وہ نکتہ ہے جس کی پوشیدگی کے باعث بہت سے لوگوں کو یہ بات اچھنبی معلوم ہوتی ہے کہ سامعین کی زبان کے علاوہ کسی زبان میں خطبہ دیا جائے، حالانکہ خطبہ ایک عبادت ہے، اس کی نوعیت ان عام خطبوں کی مانند نہیں جو عام محافل ومجالس میں سامعین کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔ بلکہ اگر لوگوں کے اس تعجب کے دائرے کو وسیع کیا جائے تو یہ معاملہ صرف خطبے تک محدود نہیں رہے گا، بلکہ یہ نماز تک وسیع ہو جائے گا، اس لیے کہ غیر عربی دان کے لیے وہ بھی ایک مختلف زبان میں مناجات ہوگی، اس طرح یہ فتنہ بڑھتا ہی رہے گا۔ امریکہ ویورپ کے کئی ممالک میں یہ فتنہ پھیل گیا ہے، چنانچہ وہاں ائمہ سامعین ہی کی زبان میں خطبہ دیتے ہیں، یہ ایک بدعت ہے جس کی پیروی کسی صورت نہیں کی جانی چاہیے، اللہ ہمیں اس فتنے سے محفوظ رکھے۔ بلکہ ہمارے علاقوں میں تو نماز کو اردو زبان میں ادا کرنے کا فتنہ پیدا ہو چکا ہے، اور اہل علم اس فتنے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔

ملازمت وتجارت پیشہ حضرات کو دین سے قریب کرنے کا ذریعہ

خلاصہ یہ ہے کہ اگر مساجد میں ان اصولوں کی رعایت رکھی جانے لگے، تو ان بالغ

نمازیوں کے لیے جو اپنی مصروفیات کی وجہ سے باقاعدہ مدارس میں پڑھ نہیں سکتے، اسی طرح ان کاروبار پیشہ افراد کے لیے بھی جو بازاروں میں کاروبار میں مصروف رہتے ہیں، نیز اس ملازمت پیشہ طبقے کے لیے جو حکومتی اداروں میں ملازمت کے باعث فرصت نہیں پاتے، یہی مساجد دینی درسگاہیں ثابت ہوں گی۔ نوجوانان امت جن کا دین دار طبقے اور دینی تعلیمی اداروں سے تعلق ٹوٹ چکا ہے، ان کو دین اسلام کی روح سکھانے اور سمجھانے کے لیے یہ ایک بہترین طریقہ کار ہوگا۔

اس کے ساتھ ساتھ اگر ہم عام گلی کوچوں اور بازاروں کے لیے لاؤڈ اسپیکر وغیرہ جدید وسائل بھی استعمال کریں تو یہ نظام ان مردوں اور عورتوں کے لیے بھی جو گھروں ہی میں رہتے ہیں (مسجدوں کی طرف رخ نہیں کرتے) بیک وقت اصلاح کے لیے مفید ہوسکتا ہے، تاکہ وہ بھی چند لمحوں پر محیط اس درس کی طرف راغب ہوں اور تربیت کا دائرہ بڑھتا ہوا ان عورتوں اور بچوں کو بھی شامل ہوجائے جو گھروں میں رہتے ہیں، خطیب کو چاہیے کہ اس کے لیے بھی خالص ایسے تربیتی موضوعات اختیار کرے جیسے موضوعات ٹیلیوژن اور ریڈیو وغیرہ پر دیے جانے والے دروس کے لیے منتخب کیے جاتے ہیں۔ اس طرح مساجد کا یہ نظام جدید وسائل وآلاتِ نشر واشاعت کی مدد سے ایک عمدہ ترین، انتہائی نفع بخش اور تربیت کے تمام گوشوں کو بیک وقت احاطہ کیے ہوئے نظام کی صورت میں نمایاں ہوگا، لیکن بہر حال توفیق وانعام دینے والی ذات تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہی کی ہے۔

الغرض نمازوں کے اجتماعات کے ساتھ ساتھ یہ مساجد دراصل توحید کی طرف دعوت کا عنوان ہیں، تبلیغ دین کا عنوان ہیں، احکام شریعت کی تعلیم کا عنوان ہیں، اور فکری تربیت، قلبی اور روحانی اصلاح کا عنوان ہیں، جیسا کہ پچھلے وقتوں میں یہی مساجد قضاء، افتاء اور عدالتی فیصلوں کا بھی عنوان ہوا کرتی تھیں۔

اخیر میں، میں رابطہ عالم اسلامی کے صدر اور ان کے رفقائے کار کا شکر یہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے ائمہ مساجد کی بیداری اور ان کے منصب کی رفعت پر تنبیہ کے لیے ہدایات پیش کرنے کی غرض سے اس مجلس کا انعقاد کیا، بلا شبہ اگر اسلامی ممالک میں مساجد کا یہ نظام واقعی متحرک اور فعال ہوجائے تو یہ ایک بہترین کاوش ثابت ہوگی۔

اللہ جل شانہٗ سے دعا ہے کہ وہ رابطہ عالم اسلامی کے ارباب حل وعقد، خصوصاً محترم صدر رابطہ عالم اسلامی کو اسلام، ملت اسلامیہ، علم اور اہل علم کی اس سے بڑھ کر خدمت کی توفیق مرحمت فرمائے، اور مجلس رابطہ عالم اسلامی کو اسلام واہل اسلام کے لیے خیر وبھلائی کی نوید بنائے۔ اللہ ہی دعاؤں کو سننے اور قبول کرنے والا ہے۔

☆☆☆

رؤیتِ ہلال

مفتی عبدالستار حامد

رمضان المبارک اورعید الفطر مسلمانوں کی عبادات اور خوشی کے ایام ہیں اور عبادات میں اصل اطاعت وفرمانبرداری ہے، جوحکم ملے اس کی تعمیل کی جائے ،اس میں کسی کی عقل ورائے کا دخل نہیں ،مثلاً: نمازیں پانچ ہی فرض کیوں ہیں؟ کم وبیش میں کیا حرج ہے؟ نماز کے اوقات مخصوص کیوں ہیں؟ اپنی مرضی سے جب چاہیں نماز کیوں نہیں پڑھ سکتے؟ وغیرہ، وغیرہ۔ان سب سوالوں کا جواب سوائے اس کے کچھ نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم اسی طرح ہے،اس کی تعمیل ہی کا نام عبادت واطاعت ہے،اپنی رائے سے اس میں کوئی کمی بیشی یا اوقات میں تغیر وتبدل کی کوئی گنجائش نہیں۔اسی طرح اس بات پر غور کیجئے کہ ۲۹ر تاریخ کو چاند ہونے یا نہ ہونے کا معاملہ سامنے آئے اورآپس میں اختلاف ہوجائے تو اس کا فیصلہ محض انسانی آراء سے نہیں ہوسکتا، بلکہ اس کے فیصلے کا طریقہ بھی اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں ہی تلاش کرنا چاہئے، کیونکہ ہماری عبادت کا مدار چاند اورسورج کی حرکات یا ان کا طلوع وغروب نہیں، بلکہ عبادات کا مدار صرف حکم الٰہی اوراتباعِ سنت ہی ہے۔

ہمارے وطن عزیز مملکت خداداد پاکستان میں تقریباً ہرسال رمضان المبارک وعید الفطر کے موقع پر چاند کے ہونے یا نہ ہونے پر جواختلاف رؤیت ہلال کمیٹی میں ہوتا ہے اورایک ہی شہر میں دومختلف دن روزہ رکھنے اور دومختلف دن عید منانے سے جواختلاف وانتشار کی کیفیت پیدا ہوتی ہے ،وہ تقریباً ہرسلیم الفطرت مسلمان کی طبیعت کومکدّر کردیتی ہے اوران دونوں یعنی رمضان المبارک کی آمد اورعیدالفطر کی خوشی کے موقعوں پر جومزہ کرکرا ہوتا ہے، اس سے ہرآدمی، ہر پاکستانی واقف ہے۔اور یہ تکلیف دہ صورتحال اس وقت مزید گھمبیر ہوجاتی ہے جب اس قسم کا کوئی مذہبی یا خالص فنی مسئلہ اہلِ علم اور ماہرین کے درمیان زیرِ بحث ہو اوران چیزوں سے ناواقف لوگ میڈیا یا اخبارات وغیرہ میں اپنی اپنی قیاس آرائیاں شروع کردیں۔اس طرزِ عمل سے ایک اچھا خاصا ماحول خراب ہوجاتا ہے اورہم غیروں کواپنے اوپر ہنسنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔

واضح رہے کہ حضور ﷺ رمضان المبارک اور رمضان کے چاند دیکھنے کا بہت اہتمام فرماتے تھے۔ اور شعبان کے چاند کے بارے میں تاکید فرمائی کہ رمضان کے چاند کی درستگی کے لیے شعبان کے چاند کو اچھی طرح اہتمام کے ساتھ دیکھو، چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

''أحصوا اھلالَ شعبانَ لرمضانَ ''۔ (سنن ترمذی، جلد اول، ص:۱۴۸)

ا:......مہینہ شروع ہونے کے لیے چاند دیکھنا ضروری ہے:

رؤیتِ ہلال کے ثبوت کے لیے فطری آنکھ سے چاند کا دیکھا جانا ضروری ہے، خواہ دوربین کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو۔ سائنسی وفلکیاتی اعتبار سے نئے مہینے کے چاند کا صرف وجود، یعنی اس کا پیدا ہونا نئے اسلامی وقمری ماہ کو شروع کرنے کے لیے ضروری وکافی نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

''جب تم چاند کو دیکھ لو تو روزہ رکھو اور جب تم چاند کو دیکھ لو تو روزہ چھوڑ دو اور اگر چاند تم پر چھپ جائے تو شعبان کے تیس دن پورے کرو''۔ (صحیح بخاری، ج:۱،ص:۲۵۶)

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

''اور جب تم ہلال (پہلی کا چاند) کو دیکھو تو روزہ رکھو اور جب تم (عید کا چاند) دیکھو تو روزہ چھوڑ دو''۔ (صحیح بخاری، ج:۱،ص:۲۵۵)

ان واضح احکامات میں حضور ﷺ نے چاند کے آنکھ سے دیکھے جانے کا اعتبار کیا اور چاند کے چھپنے کی صورت میں تیس دن مکمل کرنے کا حکم دیا، لیکن یہ نہیں فرمایا کہ اگر چاند چھپ جائے تو حساب دانوں سے یا فلکیاتی اداروں سے پوچھ لو۔ گویا آپ ﷺ کے فرمان کے مطابق چاند کے شہود (دیکھنے) کا اعتبار ہوگا، صرف وجود کا نہیں۔

۲:...... چاند کا غروب سورج کے بعد ہوتا ہے:

جب ہم رمضان المبارک یا عید کا چاند دیکھتے ہیں تو ہوتا یہ ہے کہ مغربی اُفق پر پہلے سورج غروب ہوتا ہے، پھر چاند آہستہ آہستہ غروب ہو جاتا ہے۔ تو یہ معلوم ہوا کہ سورج پہلے غروب ہوتا ہے اور اس کے بعد چاند، یعنی ہم چاند کو اس دن غروب ہونے سے پہلے پہلے دیکھتے ہیں، دوسرے دن یہ چاند مزید موٹا اور دیر سے غروب ہوتا ہے، حتیٰ کہ چودھویں تاریخ کو دیکھتے ہیں کہ ادھر مغرب میں سورج غروب ہو رہا ہوتا ہے اور دوسری طرف مشرقی اُفق سے اپنی پوری آب وتاب سے چاند چمکتا ہوا اُبھرنے لگتا ہے۔

۳:...... ولادتِ قمر:

زمین، چاند اور سورج جب ایک لائن میں آجاتے ہیں تو اس کو ''محاق''، ''اجتماعِ شمس و قمر'' یا ''ولادتِ قمر'' یا فلکیاتی اصطلاح میں ''New Moon'' کہتے ہیں۔ اس لمحہ چاند کا تاریک

حصہ ہماری زمین کی طرف ہوتا ہے اور روشن و چمکدار حصہ سورج کی طرف ہوتا ہے، اس کے بعد جیسے ہی چاند اس سیدھ سے نکلتا ہے تو ماہرین فلکیات اس کو ''New Moon'' کہتے ہیں اور اس کو نیا چاند شمار کر لیتے ہیں۔ اس لمحہ چاند کے نظر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ساری دنیا کے ماہرین فلکیات اسی لمحہ سے چاند کے مہینے اور اس کی گردش کا حساب شروع کرتے ہیں، اسی وجہ سے اُسے ''ولادتِ قمر'' یا ''New Moon'' کہتے ہیں۔ یہ کیفیت دن رات کے کسی لمحہ بھی ہوسکتی ہے۔ یاد رہے کہ چاند کی پہلی تاریخ کا ''اسلامی ہلال'' (NEW MooN) اور چیز ہے، جس سے مسلمانوں کے قمری ماہ کی ابتداء ہوتی ہے، جس کے لیے رؤیت ضروری ہے اور یہ رؤیت اس ''New Moon'' کے تقریباً ۲۲، ۲۴ گھنٹے کے بعد ہی ممکن ہوتی ہے۔

۴:......شرعی اعتبار سے چاند کی رؤیت کا مدار:

شریعت نے رؤیتِ ہلال کے معاملے میں ریاضی کے حسابات کے بجائے آنکھوں کی رؤیت کو مدار بنایا ہے۔ اس کا اہم فائدہ یہ ہے کہ اس پر عمل آسان اور ہر خاص و عام کے لیے ممکن ہے، کیونکہ دینِ اسلام پوری انسانیت کے لیے ہے اور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد گاؤں، دیہاتوں اور قصبوں میں رہنے والے ہیں، ان سب کو ریاضی کے حسابات کا مکلّف بنانا ان کے لیے پریشانی کا باعث بن سکتا ہے، لہٰذا جب چاند اپنی فطری آنکھ سے نظر آئے تو اس کی رؤیت کا فیصلہ کیا جائے گا، ورنہ نہیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

''مہینہ ۲۹؍راتوں کا ہوتا ہے، پس تم روزہ مت رکھو جب تک کہ اس (ہلال) کو دیکھ نہ لو، پس اگر وہ تم پر چھپ جائے تو ۳۰ دن کی گنتی پوری کرلو۔'' (صحیح بخاری، ج:۱،ص:۲۵۶)

چاند چھپ جانے کے لیے ''غُمَّ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، یعنی جس چیز کا وجود تو ہو مگر نظر سے اُوجھل ہو جائے، اس کو پوشیدہ یا ''غُمَّ'' کہا جاتا ہے، یعنی ہے مگر نظر سے اُوجھل ہے۔ اس صورت میں صریح حکم ہے کہ تیس روزے پورے کرو۔

۵:...... چاند نظر نہ آنے کی وجوہات:

رؤیتِ ہلال کے معاملے میں اس کیفیت کے پیدا ہونے کے بہت سے قدرتی و فلکیاتی عوامل ہیں:

۱- چاند کی عمر کم ہونا:

''New Moon'' کے ٹائم سے بیس گھنٹے سے کم عمر کا چاند عموماً بہترین کیفیات میں بھی نظر نہیں آتا۔ ۳۰ گھنٹے کا چاند عموماً آسانی سے نظر آجاتا ہے۔ ۲۰ سے ۳۰ گھنٹوں کے درمیانی عمر کا

چاند کبھی نظر آجاتا ہے اور کبھی نہیں۔

۲- چاند کا سورج سے زاویائی فاصلہ:

اگر چاند کی سورج سے دوری بارہ ڈگری سے کم ہو تو وہ سورج کی تیز شعاعوں کی وجہ سے نظر نہیں آتا۔ ہاں! جب چاند سورج سے تقریباً بارہ ڈگری دور ہو جائے تو سورج کی تیز شعاعوں سے باہر نکل جاتا ہے اور بغیر دوربین کے فطری آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے اور چاند کا تقریباً سات فیصد روشن حصہ ہمارے سامنے آجاتا ہے، جس کو ہم ''ہلال'' یا پہلی کا چاند کہتے ہیں۔ جو چاند کے قطر (Diameter) ۳۴۷۶Km کے اعتبار سے تقریباً ۲۴۳ km موٹا چاند بنتا ہے۔

۳- سورج کا اُفق سے نیچے ہونا:

چاند دکھائی دینے کے لیے ضروری ہے کہ سورج زمین سے تقریباً ۵ ڈگری نیچے جا چکا ہو اور اس کی تیز شعاعیں کچھ کم ہو گئی ہوں، اس کا اندازہ تقریباً ۱۵ سے ۲۰ منٹ ہے، یہ اس لیے کہ سورج ڈوبنے کے فوراً بعد سورج کی تیز شعاعوں (شفق احمر) کی روشنی میں پہلی کا چاند نظر نہیں آتا۔

۴- چاند کا ارتفاع:

سورج غروب ہونے کے بعد چاند زمین سے اتنا اونچا ہو کہ اہل زمین کو نظر آجائے۔ اگر سورج ڈوبنے سے پہلے چاند ڈوب گیا یا بعد میں ڈوبا، لیکن بہت کم اونچا رہا تو اتنا باریک ''ہلال'' زمین والوں کو نظر نہیں آئے گا، لہٰذا پہلے دن چاند نظر آنے کے لیے اس کی زمین سے اونچائی ۱۰ ڈگری ہونا ضروری ہے۔

۵- مطلع کی کیفیت:

مطلع صاف وشفاف ہو، اَبر آلود اور گرد آلود نہ ہو۔

۶- فضا صاف ہو:

طوفان اور بادوباراں نہ ہو، زیادہ گرمی نہ ہو، ورنہ زمین کی تپش اور ہیٹ (Heat) کی جو لہریں اُٹھتی ہیں وہ چاند دیکھنے میں مانع ہوتی ہیں۔ زیادہ سردی بھی نہ ہو، ورنہ دھند میں چاند صاف نظر نہیں آئے گا۔ فضا میں زیادہ نمی اور زیادہ خشکی بھی نہ ہو۔ یہ حالات بھی رؤیتِ ہلال کے لیے کم سازگار ہوتے ہیں۔

۷- مقامِ مشاہدہ کا محل وقوع:

خط استوا سے کم طول بلد اور کم عرض بلد والے شہروں میں چاند جلدی نظر آجائے گا اور جن شہروں میں سورج دیر سے غروب ہوگا، وہاں چاند دکھائی دیئے جانے کے امکانات زیادہ ہوں گے،

مثلاً: پاکستان کے مطلع پر چاند نظر نہیں آیا، لیکن جب سورج سعودی عرب کے مطلع میں پاکستان سے۲ر گھنٹے کے بعد غروب ہوگا، اسی تاریخ کو وہاں چاند نظر آنا ممکن ہوگا، کیونکہ چاند کی عمر بھی دوگھنٹہ زیادہ ہوگئی اوران دوگھنٹوں میں وہ سعودی عرب کے مطلع میں سورج سے زیادہ دور بھی ہوگیا اوران دوگھنٹوں میں چاند کا ارتفاعی زاویہ بھی بڑھ گیا۔ان وجوہات کی بناء پرسعودی عرب میں چاند پاکستان سے پہلے نظر آجاتا ہے۔ چناں چہ ایسا ممکن ہے کہ ایک ہی تاریخ اورایک ہی دن چاند پاکستان میں نظر نہ آئے اورسعودی عرب میں نظر آجائے۔

۶......اختلافِ مطالع

رؤیتِ ہلال کے معاملہ میں ایک اہم سوال اختلافِ مطالع کا بھی سامنے آتا ہے۔سورج اور چاند دنیا میں ہر وقت کہیں نہ کہیں تو موجود رہتے ہیں،سورج ایک جگہ طلوع ہورہا ہوتا ہے تو دوسری جگہ غروب، کہیں نصف النہار ہوتا ہے تو کہیں وقت عشاء،اسی طرح چاند ایک جگہ ہلال کی صورت میں ہے تو دوسری جگہ تربیع کی شکل میں اور کہیں پورا چاند بن کر چمک رہا ہوتا ہے۔جب صورتحال یہی ہے تو اگر ایک جگہ کے لوگ کسی مہینے کا چاند دیکھ لیں تو ایسے شہروں میں جہاں ابھی چاند نظر نہیں آیا تو کیا ان شہروں میں بھی اس چاند کا اعتبار کیا جائے گا یانہیں؟اس میں ائمہ مجتہدین اورفقہائے کرام کے مختلف اقوال منقول ہیں اور اختلاف کی وجہ یہ نہیں کہ اختلاف مطالع دنیا میں موجود نہیں، بلکہ بحث اس میں ہے کہ اس اختلاف مطالع کا شرعی احکام میں اعتبار کیا جائے یانہیں؟اس مسئلہ میں فقہائے امت اورعلمائے کرام کے تین مسلک ہوگئے:

ایک: یہ کہ اختلاف مطالع کا ہر جگہ ہر حال میں اعتبار کیا جائے۔

دوسرا: یہ کہ اختلاف مطالع کا کسی حال میں بھی اعتبار نہ کیا جائے۔

تیسرا: یہ کہ بلادِ بعیدہ میں اعتبار کیا جائے اور بلادِ قریبہ میں اعتبار نہ کیا جائے۔

اور عجیب اتفاق ہے کہ یہ تینوں طرح کا اختلاف فقہائے امت،حنفی ، مالکی، شافعی اور حنبلی چاروں فقہ کے فقہاء میں موجود ہے،فرق صرف قلت وکثرت کا ہے۔

اس اختلاف کی وضاحت:

اختلاف مطالع کا اگر ہر جگہ اور ہر شہر میں اعتبار کیا جائے تو پھر ایک ہی ملک میں۲ یا۳ مختلف دنوں میں روزہ ہوگا اور مختلف دنوں میں کئی عیدیں ہوں گی، یہ بھی تکلیف وانتشار کا باعث ہے اوراگر اختلاف مطالع کا اعتبار نہ کیا جائے تو پھر کسی ایک جگہ کے چاند کو پوری دنیا پر لاگو کرنا لازم آئے گا، چاہے ان لوگوں نے چاند دیکھا بھی نہ ہو، یہ بھی شرعی احکامات اورصریح حدیث نبوی کہ: ’’چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو‘‘ کی کھلی خلاف ورزی ہے اوراس میں یہ نقصان

بھی ہے کہ کبھی مہینہ گھٹ کر اٹھائیس یا ستائیس دن کا ہو جائے اور ایسے ہی کبھی مہینہ بڑھ کر اکتیس یا بتیس دن کا ہو جائے ،جس کی شریعت میں کوئی نظیر نہیں ملتی ۔

اور بلاد قریبہ وبعیدہ کی تعریف کا کیا معیار ہوگا ؟ اس کی وضاحت کتب فقہ میں مذکور نہیں ۔البتہ علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے اس کا یہ معیار تجویز فرمایا ہے کہ جو بلاد اتنی دور ہوں کہ اگر ان کے اختلاف مطالع کا اعتبار نہ کریں تو ۲ر دن کا فرق پڑ جائے تو وہاں اختلاف مطالع معتبر ہوگا ، یعنی ایک جگہ کی رؤیت دوسری جگہ کے لیے کافی نہ ہوگی ، کیونکہ اگر ایسے بلاد بعیدہ میں بھی اختلاف مطالع کا اعتبار نہ کریں تو مہینہ اٹھائیس یا اکتیس دن کا ہوسکتا ہے جو کہ خلاف شرع ہے ۔اور وہ بلاد قریبہ جہاں دو دن سے کم یعنی ایک دن کا فرق ہو، وہاں اختلاف مطالع معتبر نہیں ہوگا ، ایسی صورت میں ایک شہر کی رؤیت دوسرے شہر کے لیے کافی ہوسکتی ہے ۔ایک ہی ملک میں مختلف شہروں کے لوگ اگر اپنے اپنے چاند کے اعتبار سے الگ الگ روزہ رکھنے اور عید منانے پر اصرار کریں تو ملک میں افتراق وانتشار کی فضاء پیدا ہو جائے گی ۔

نیز آج کل ہوائی جہاز اور کمپیوٹر نے ساری دنیا کے مشرق ومغرب کو ایک کر ڈالا ہے ، ایک جگہ کی شہادت دوسری جگہ پہنچنا کوئی قضیہ فرضیہ نہیں رہا ، بلکہ حقیقت اور روز مرہ کا معمول بن گیا ہے اور اس کے نتیجہ میں اگر مشرق کی شہادت مغرب میں اور مغرب کی شہادت مشرق میں حجت مانی جائے تو کسی جگہ مہینہ اٹھائیس دن کا اور کسی جگہ اکتیس دن کا ہونا لازم آئے گا جو کہ شرعاً غلط ہے ، لہٰذا اس لیے ایسے بلاد بعیدہ میں جہاں مہینے کے دنوں میں کمی بیشی کا امکان ہو تو اختلاف مطالع کا اعتبار کرنا ہی ناگزیر اور مسلک حنفیہ کے عین مطابق ہوگا ۔

متأخرین حنفیہ نے ’’تبیین الحقائق‘‘ و’’بدائع الصنائع‘‘ میں اس قول پر فتویٰ دیا ہے کہ بلاد بعیدہ میں ہمارے نزدیک بھی اختلاف مطالع معتبر ہے ۔علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے بھی اس قول کو ترجیح دی ہے ۔حضرت مفتی محمد شفیعؒ نے اپنی تحقیق ’’رؤیت ہلال‘‘ میں اس کو نقل کیا ہے ۔حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی رائے بھی یہی تھی ۔محرم الحرام ۱۳۷۴ھ بمطابق ستمبر ۱۹۵۴ء مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں ’’مسئلہ رؤیتِ ہلال‘‘ سے متعلق جملہ مسائل پر پاکستان بھر کے مفتیان کرام کا اجلاس بلایا گیا تھا ، جس میں ’’رؤیت ہلال‘‘ سے متعلق بہت سارے پیچیدہ امور کے اہم فیصلے کیے گئے تھے ، لیکن حکومتی سطح پر معاملہ جوں کا توں چلتا رہا ۔ پھر حضرت مفتی محمد شفیعؒ ، علامہ ظفر احمد عثمانیؒ ، علامہ محمد یوسف بنوریؒ اور مفتی رشید احمدؒ نے شوال ۱۳۸۶ھ بمطابق ۱۹۶۶ء میں پورے ملک میں اختلافِ مطالع کو غیر معتبر قرار دے کر پورے ملک میں ایک رؤیت ہلال کو تسلیم کر کے اس کے تنفیذِ حکم کے لیے چند تجاویز حکومت کو بھیجی تھیں ۔

فائدہ:

جس طرح انتظامی طور پر پورے ملک پاکستان کا معیاری ایک طول بلد ۷۵% ڈگری سے رائج ہے اور ہم اپنی روزمرہ زندگی میں اس سے کام لیتے ہیں اور ہم اپنے اپنے مقامی وقتوں کو نظر انداز کردیتے ہیں، بلکہ اکثریت کو اس کا پتا بھی نہیں اور اس سے ہمیں کسی قسم کی کوئی پریشانی یا الجھن پیش نہیں آتی، بلکہ سہولت اسی ایک معیاری رائج وقت میں ہے تو اسی طرح سہولت وآسانی کے لیے اگر پورے ملک میں اتفاق واتحاد کی خاطر ایک جگہ کی صحیح شرعی رؤیت کو مان کر اُسے پورے ملک میں نافذ کردیا جائے، اختلاف مطالع کے فقہی اختلاف کو ایک ہی ملک کے تمام مختلف شہروں میں تسلیم نہ کیا جائے، بلکہ دو مختلف ملکوں کے مابین تسلیم کرلیا جائے تو اس سے تمام فقہی اقوال پر کسی نہ کسی درجہ میں عمل ہوجائے گا اور لوگ بھی پریشانی والجھن اور افتراق وانتشار سے بچتے ہوئے آسانی وسہولت کے ساتھ شرعی احکامات پر عمل پیرا ہوسکیں گے اور رمضان المبارک کی حقیقی عبادات اور عید کی سچی خوشیوں سے لطف اندوز ہوسکیں گے۔ اس کی تائید اس بات سے بھی ہوسکتی ہے کہ فقہائے کرام کی عبارات ''لأهل كل بلد رؤية ولكل أهل بلد رؤيتهم'' میں اگر غور وفکر سے کام لیں اور لفظ ''بلد'' کی تحقیق کریں تو ''تاج العروس'' اور ''لسان العرب'' کے حوالے سے یہ وضاحت سامنے آتی ہے کہ ''البلد'' اگر بغیر تاء تانیث کے ہو تو اس سے مراد جنس مکان یعنی اقلیم وملک ہوتا ہے، جیسے ''عراق وشام'' اور اگر ''البلدة'' تاء تانیث کے ساتھ ہو تو اس سے خاص شہر مراد ہوتا ہے، جیسے بصرہ ودمشق۔ پھر اس شبہ کا بھی ازالہ کردیا کہ ''البلد'' کا لفظ مکہ مکرمہ کے لیے قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے، حالانکہ وہ ملک نہیں، بلکہ ایک شہر ہے، اس کا جواب دیتے ہیں کہ اگرچہ مکہ شہر ہے، لیکن اس کی عظمت شان کی وجہ سے اُسے ''البلد'' کہا گیا ہے، گویا کہ یہ ایک شہر نہیں، بلکہ پوری ایک اقلیم اور پورا ملک ہے۔ اس وضاحت سے اگر ہم مختلف شہروں کے درمیان اختلاف مطالع کا اعتبار نہ کریں اور متفرق شہروں کے مجموعہ یعنی ایک ملک میں ایک ہی روزہ اور ایک ہی دن عید کا اہتمام کرلیں اور مختلف ملکوں کے درمیان اختلاف مطالع کو باقی رکھ کر ہر ملک کی اپنی رؤیت کا اعتبار کرلیں تو اس سے بھی کافی حد تک فقہاء کرام کی منشأ ومراد پر عمل ہوسکتا ہے۔

اس مسئلہ کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ جب کسی ملک کا حاکم یا اس کا مقرر کردہ شخص رمضان المبارک یا عید کے چاند کا اعلان کردے تو اس اعلان کی پابندی ضروری ولازمی ہوجاتی ہے اور جو شخص اس اعلان کی خلاف ورزی کرتا ہے، وہ گناہ گار اور امت میں افتراق وانتشار پھیلانے والا شمار ہوتا ہے۔

☆☆☆

برقی تصویر

(چوتھی قسط) مفتی شعیب عالم

تخیل کا دخل

شاعری، نقاشی، موسیقی اور مصوری وغیرہ فنونِ لطیفہ کی قسمیں ہیں۔ فنون لطیفہ دو مختلف قسموں میں تقسیم کیے جاتے ہیں:

ایک: وہ جن سے باصرہ محظوظ ہوتا ہے۔

دوسرے: وہ جو سامعہ کو رام کرتے ہیں۔

مصوری باصرہ کی لذت اور نظر کی عشرت ہے، اس لیے قسم اول میں داخل ہے۔

فنون لطیفہ میں نقل نہیں، بلکہ تخلیق مقصود ہوتی ہے۔ تخلیق کی تفہیم میں شعر وشاعری کی تمثیل زیادہ مفید رہے گی۔ شاعر سوسائٹی کا ترجمان اور ایک حساس دل اور گہری نگاہ کا مالک ہوتا ہے۔ جب کوئی واقعہ، حادثہ، خیال یا منظر اُسے متاثر کرتا ہے تو وہ اور لوگوں کو اپنے محسوسات اور جذبات میں شامل کرنے کا فیصلہ کرتا ہے اور جب وہ منظر، تجربے یا واقعے کو بیان کرتا ہے تو اپنے تخیل کی مدد سے اسے بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے اور اس خیال آفرینی، رنگ آرائی اور مبالغہ آمیزی پر اس کی تحسین وتوصیف بھی کی جاتی ہے، مثلاً: وہ خوبصورت کو زیادہ خوبصورت اور بدصورت کو اور زیادہ بدصورت بنا کر پیش کرتا ہے۔ کہیں غربت دکھانی ہو تو حقیقت میں جتنی ہو اس سے زیادہ دکھاتا ہے، مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ متاثر ہوں اور وہی کچھ محسوس کریں جو وہ خود محسوس کر رہا ہے۔

شاعر کی طرح مصور جب کسی بصری منظر میں کوئی ایسا عنصر نمایاں کر دے جو اصل میں نہ ہو تو اسے مصور کی تخلیق کہتے ہیں۔ مصور صرف نقش ونگار نہیں بناتا، مجرد خطوط نہیں کھینچتا، محض رنگوں کا استعمال نہیں کرتا ہے، بلکہ ایک ماہر نفسیات کی طرح دل ودماغ کی کیفیات کی باقاعدہ وضاحت کرتا ہے، وہ لطیف جذبات او باطنی احساسات کو نقوش کی مدد اور رنگوں کی زبان میں محسوس کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر وہ صرف حقیقت کو بلا کم وکاست دکھائے یا اصل کو ہو بہو اور جوں کا توں پیش

کرے تو اس کی کاوش کو تخلیق نہیں کہیں گے، کیوں کہ صرف حقیقت کو جیسی وہ ہے، ویسے ہی دکھانا یا واقعے کو واقعہ دکھانا تخلیق نہیں ہے۔

بہرحال فنون لطیفہ میں تخلیق مقصود ہوا کرتی ہے، اس لیے مصوری میں بھی تخلیق ہی مقصود ہوا کرے گی، کیوں کہ مصوری فنونِ لطیفہ کی قسم ہے اور قاعدہ ہے کہ قِسم میں اس کا مَقسم موجود ہوا کرتا ہے، مقسم کے خواص اس کی قسم میں بھی پائے جاتے ہیں۔ دونوں میں کلیت اور جزئیت کا فرق ضرور ہوتا ہے، لیکن دونوں کا ہدف، مقصد اور حکم ایک ہی ہوا کرتا ہے۔

اب ذرا ماضی کے اوراق پلٹتے ہیں اور تصویر کے بارے میں بعض اہل علم کے نقطہ نظر کو اس کی روح کے مطابق سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فوٹو کے جواز پر علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ایک طویل مضمون سپردِ قلم فرمایا تھا، جو معارف اعظم گڑھ کے جون ۱۹۱۹ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا، مذکورہ مضمون میں حضرت سید صاحبؒ نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ:

''فوٹوگرافی کیا مصوری ہے؟ اور فوٹوگرافر پر کیا مصور کا اطلاق ہوگا؟''

اور پھر مضمون کی اختتامی سطروں میں اپنے قائم کردہ سوال کا خود ہی یوں جواب دیا تھا:

> ''فوٹوگرافی درحقیقت عکاسی ہے۔ جس طرح آئینہ، پانی اور دیگر شفاف چیزوں پر صورت کا عکس اتر آتا ہے اور اس کو کوئی گناہ نہیں سمجھتا، اسی طرح فوٹو کے شیشہ پر مُقبِل کا عکس اترتا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ آئینہ وغیرہ کا عکس پائیدار اور قائم نہیں رہتا اور فوٹو کا عکس مسالہ لگا کر قائم کرلیا جاتا ہے، ورنہ فوٹوگرافر مصور کی طرح اعضاء کی تخلیق وتکوین نہیں کرتا۔''

اس اقتباس سے واضح ہے کہ سید سلیمان ندویؒ تخلیق اور تکوین کو عکس اور تصویر کے درمیان ''وجہِ فرق اور مابہ الامتیاز'' سمجھتے ہیں، اور عکس اور تصویر کے درمیان پائیداری اور ناپائیداری کا فرق بھی انہیں تسلیم ہے، مگر ان کے نزدیک یہ فرق غیر اہم ہے، اس لیے اسے نظر انداز فرمارہے ہیں۔

شیخ محمد بخیت المطیعی کا موقف

معارف کے مذکورہ مضمون سے پہلے مصر کے شیخ الازہر علامہ محمد بخیت مطیعی فوٹوگرافی کے جواز کا فتویٰ دے چکے تھے، سید سلیمان ندویؒ بھی اپنے مضمون میں ان سے متاثر نظر آتے ہیں۔

شیخ محمد بخیت کا فرمانا تھا کہ فوٹوگرافی میں کسی شئے کا سایہ یا عکس ایک خصوصی تکنیک کی مدد سے حاصل کرلیا جاتا ہے، اس لیے وہ حرام نہیں ہے، کیوں کہ حرام یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے اس جیسی کوئی ایسی شئے اپنے تخیل کی مدد سے بنانے کی کوشش کی جائے جس کا پہلے سے وجود نہ ہو،

جب کہ کیمرے سے لی گئی تصویر میں تصور اور تخیل کو کوئی دخل نہیں ہوتا ہے، بلکہ خدا کی مخلوق جیسی ہوتی ہے، ویسے ہی اس کا عکس اتار لیا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر کیمرا کوئی نئی صورت تخلیق نہیں کرتا ہے، بلکہ خدا ہی کی بنائی ہوئی مخلوق ہوتی ہے جس کا عکس کیمرا پیش کر دیتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ جو کچھ ہم آئینے میں دیکھتے ہیں، اسے ایک جگہ پابند کرلیا جائے۔کوئی نہیں کہتا کہ آئینے میں دیکھنا حرام ہے، کیوں کہ وہ تو صرف اللہ جل شانہ کی مخلوق کی شبیہ دکھاتا ہے۔

مصوری میں تخلیق مقصود ہوتی ہے۔اگر یہ نکتہ ذہن میں مستحضر ہوتو مطلب یہ ہوا کہ کیمرے سے اتاری گئی تصویر' انسان کے داخلی جذبات، باطنی احساسات اور قلبی تاثرات سے خالی ہوتی ہے، اس لیے اس میں تخلیق نہیں ہوتی اور تخلیق نہ ہوتو اُسے مصوری کہنا درست نہیں ہے۔

شیخ بخیت کے اس اصول کا اطلاق ویڈیو کیمرے پر بھی ہوتا ہے، کیونکہ ویڈیو کیمرا اس سے زیادہ کچھ نہیں کرتا کہ زیادہ تعداد میں ساکت تصویریں کھینچ لیتا ہے، جنہیں تیزی سے ایک کے بعد ایک دکھانے سے وہ متحرک محسوس ہوتی ہیں، اس لیے جس طرح فوٹوگرافی درست ہے، اسی طرح ویڈیو فلم بھی جائز ہے۔

عرب دنیا میں شیخ بخیت کی تائید بھی ہوئی اور تردید بھی، ان کے موافق بھی لکھا گیا اور مخالف بھی۔ عام اہل علم نے ان کی رائے کے ساتھ اتفاق نہیں کیا، تاہم ان کی دلیل بعض عرب علماء کو متاثر کرنے میں کامیاب رہی۔ برصغیر کے بعض اعلیٰ دماغ اور مشہور ہستیاں بھی ان سے متاثر ہوئیں، مگر جب حق ان حق پرستوں پر واضح ہوگیا تو انہوں سلفِ صالحین کی یاد تازہ کرتے ہوئے برملا اپنے موقف سے رجوع فرمالیا۔

محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ ماضی کے ان واقعات کے بارے میں بڑی حد تک چشم دید گواہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے ان تمام حالات کو دل کی آنکھوں سے دیکھا تھا اور بصیرت کی نگاہوں سے جانچا تھا۔اس تاریخی علمی بحث کو، اس کے محرکات ومضمرات کو اور تصویر کے فتنے کے خلاف حضرت کشمیریؒ کی قیادت میں ان کے لائق وفائق تلامذہ کی مساعی کو بیان کرتے ہوئے حضرت بنوریؒ تحریر فرماتے ہیں:

> ''حدیث نبوی میں تصویر سازی پر جو شدید وعید آئی ہے، وہ ہر جاندار کی تصویر میں جاری ہے، اور تمام امت جاندار اشیاء کی تصاویر کی حرمت پر متفق ہے۔ لیکن خدا غارت کرے اس مغربی تجدد کو کہ اس نے ایک متفقہ حرام کو حلال ثابت کرنا شروع کر دیا۔اس فتنۂ اباحیت کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا مرکز مصر اور قاہرہ تھا، چنانچہ آج سے نصف صدی پہلے قاہرہ کے مشہور شیخ محمد بخیت مطیعی نے جو شیخ الازہر بھی تھے''إباحة الصور الفوتوغرافية ''کے نام سے ایک

رسالہ تالیف کیا تھا، جس میں انہوں نے کیمرے کے فوٹو کے جواز کا فتویٰ دیا تھا۔ اس وقت عام علماء مصر نے ان کے فتوی کی مخالفت کی، حتیٰ کہ ان کے شاگرد رشید علامہ شیخ مصطفیٰ حمامی نے اپنی کتاب ''النهضة الإصلاحية للأسرة الإسلامية'' میں اس پر شدید تنقید کی اور کتاب میں صفحہ: ۲۶۰ سے ۲۶۸ اور صفحہ: ۳۱۰ سے صفحہ: ۳۲۸ تک اس پر بڑا ابلیغ رد لکھا، ایک جگہ وہ لکھتے ہیں: ''تمام اُمت کے گناہوں کا بار شیخ کی گردن پر ہوگا کہ انہوں نے امت کے لیے شر اور گناہ کا دروازہ کھول دیا۔

اسی زمانہ میں حضرت مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے قلم سے ماہنامہ ''معارف'' میں ایک طویل مقالہ شیخ مطیعی کے رسالہ کی روشنی میں نکلا، اس وقت امام العصر مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کو جب اس کی اطلاع ہوئی اور اس مضمون سے واقف ہوئے تو آپ کی تحریک پر آپ کے تلامذہ میں سے حضرت مولانا محمد شفیع صاحبؒ نے ماہنامہ ''القاسم'' میں اس پر تردیدی مقالہ شائع فرمایا۔ وہ مقالہ حضرت شیخ کشمیری رحمہ اللہ کی راہنمائی میں مرتب ہوا، جسے بعد میں ''**التصوير لأحكام التصاوير**'' کے نام سے حضرت مفتی صاحبؒ نے شائع فرمایا۔

یہ واضح رہے کہ حضرت سید صاحب موصوف مرحوم نے اپنی حیات طیبہ کے آخری سالوں میں جب کہ آپ کی عمر ساٹھ تک پہنچ چکی تھی، جن چند مسائل سے رجوع فرمالیا تھا، ان میں فوٹو کے جواز کے مسئلے سے بھی رجوع فرمایا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ جیسے آزاد صاحبِ قلم نے اگرچہ ذوالقرنین کو سائرس بنا کر اس کے مجسمے کا فوٹو ترجمان القرآن میں شائع کیا تھا، لیکن بعد میں اُسے ترجمان القرآن کے تمام نسخوں سے نکال کر تصویر کے حرام ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔''(۱)

اہل حق گروہ کی یہ علامت ہے کہ وہ دین کی نشر و اشاعت کے ساتھ فتنوں کے تعاقب میں سرگرم رہتا ہے، اس طرح دین کے دفاع اور حفاظت کا اجر و ثواب بھی سمیٹ لیتا ہے۔ حضرت کشمیریؒ کو اس علمی رنگ میں اٹھنے والے فتنے کا بروقت احساس ہوا اور آپؒ نے علمی محاذ پر اس کی سرکوبی کی۔ آپ کی تحریک و ترغیب، توجہ و اہتمام، علمی معاونت و رہنمائی اور آپؒ کے جلیل القدر تلامذہ کی مساعی اور مسلسل و پیہم ضربوں سے یہ فتنہ چاروں شانے چت ہوگیا۔ مفتی اعظم مفتی محمد شفیعؒ کی علوم انوری سے بھرپور ضرب تو بہت ہی کاری اور آخری ثابت ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے دین محمدی کو صنعتِ آزری سے محفوظ رکھا۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے جو سوال قائم کیا تھا کہ فوٹو گرافی مصوری ہے یا نہیں؟ اور شیخ

بخیتؒ کی یہ دلیل کہ کیمرے کے ذریعے منظر کشی میں مصور کے تصور اور تخیل کو دخل نہیں ہوتا ۔ دونوں باتوں کا الگ سے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ، کیونکہ دونوں کے موقف میں صرف الفاظ کا فرق اور تعبیر کا اختلاف ہے ،مقصد اور نتیجہ ایک ہی ہے ، وہ یہ کہ فوٹو گرافر مصور نہیں ہے ، کیونکہ فوٹو گرافی میں تصور وتخیل کو دخل نہیں ہوتا ہے ۔ اس استدلال کا جواب حضرات اکابر سے اس طرح منقول ہے کہ شریعت نے صرف جاندار کی ظاہری سطح کا نقش بنا دینے کا نام ہی تصویر رکھا ہے ، چاہے اس میں مصور کے تصور وتخیل کو دخل ہو یا نہ ہو ۔

علاوہ ازیں یہ دلیل بھی درست نہیں کہ جس صورت میں مصور اعضاء کی تخلیق وتکوین نہ کرے تو وہ تصویر کشی جائز ہو جائے ، کیونکہ احادیث میں حرمتِ تصاویر کی متعدد وجوہ بیان کی گئی ہیں ۔ اگر کسی تصویر میں بالفرض ایک وجہ حرمت کی موجود نہ ہو تو اس سے وہ تصویر حلال نہیں ہو جاتی ، کیونکہ دوسری وجوہِ حرمت وہاں موجود اور قائم ہوتی ہیں ، مثلاً : ان کا ذریعۂ شرک ہونا اور رحمت کے فرشتوں کے داخلہ سے مانع ہونا ، وغیرہ ۔ (۲)

متحرک تصاویر

کوئی کیمرا متحرک تصویر کھینچتا ہے ، نہ ہی کوئی آلہ متحرک تصاویر دکھاتا ہے ۔ مگر پھر بھی اسکرین پر جیتی جاگتی ، بولتی ، چلتی ، پھرتی ، بھاگتی اور دوڑتی تصویریں نظر آتی ہیں ۔ اسکرین کے پیچھے ایک سرگرم اور چہل پہل سے بھرپور زندگی کا احساس ہوتا ہے ۔ انسان دوڑتے ہوئے ، پرندے اُڑتے ہوئے ، درخت جھومتے ہوئے اور کھیت لہلہاتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ کھیل کے میدان میں گیند اچھل کر تماشائیوں میں جا گرتی ہے اور کشتی موجوں کو کاٹتی ہوئی ، سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے ۔ یہ سب نقل وحرکت ہماری آنکھ کا دھوکہ اور مشاہدے کی غلطی ہے ۔ انسانی حواس میں سے حاسۂ بصر کثرت سے دھوکہ کھاتی ہے ۔ روزمرہ کی زندگی میں بارہا اس کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے ، اس لیے اس بدیہی حقیقت پر دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں ۔

ناظر کو متحرک تصویر کا احساس اس طرح دلایا جاتا ہے کہ کیمرا ایک ہی منظر کی معمولی فرق کے ساتھ زیادہ تعداد میں ساکت تصویریں کھینچ لیتا ہے اور جب انہیں تیزی سے یکے بعد دیگرے دکھایا جاتا ہے تو ناظر کو اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ کب ایک تصویر آنکھوں سے اوجھل ہوئی اور اس کی جگہ دوسری نے لے لی ، یوں تیز رفتار تسلسل سے منظر متحرک اور مسلسل محسوس ہوتا ہے ۔

اس فنی کاریگری کے علاوہ ایک وجہ اور بھی ہے جو تسلسل کا احساس دلاتی ہے ۔ جب ہم کسی جسم کو دیکھتے ہیں تو آنکھوں سے دور ہو جانے کے باوجود سیکنڈ کے سولہویں حصے تک اس کا نقش ہمارے دماغ پر رہتا ہے ۔ آنکھ کی اس خاصیت کو نظر کی بقاء (Persistence Of Vision) کہتے

ہیں۔ ابھی ایک تصویر کا نقش ہمارے ذہن سے غائب نہیں ہوتا ہے کہ فوراً دوسری تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اگر ہم اسی طرح ایک سیکنڈ میں کئی لگاتار تصویریں دیکھیں تو ہمیں تسلسل کا احساس ہوگا، کیوں کہ ایک تصویر کا اثر ختم ہونے سے پہلے دوسری کا اثر شروع ہو جائے گا۔

متحرک تصاویر کی حقیقت معلوم ہونے کے بعد اب سینما کے موضوع پر خامہ فرسائی مناسب معلوم ہوتی ہے۔ اصل مقصد اس بحث کو چھیڑنے کا یہ ہے کہ کیا سینما کی تصویر متحرک اور غیر قار ہونے کی بناء پر تصویر کی تعریف سے خارج ہے؟

سینما کی متحرک تصویریں

سینما میں سلسلہ وار تصویروں کا سامنے کے پردے پر عکس ڈالا جاتا ہے۔ تیز رفتار تسلسل سے آنکھ کو منظر متحرک محسوس ہوتا ہے اور تصویریں چمک دمک دکھانے کے بعد آن کی آن میں غائب ہو جاتی ہیں، جس سے ان کے ناپائیدار اور غیر قار ہونے کا تصور پختہ ہوتا ہے، حالانکہ حقیقت اس طرح نہیں ہوتی جس طرح نظر آتی ہے۔ تمام تصویریں ساکن ہوتی ہیں، مگر ان کا سکون انتہائی قلیل وقفے کے لیے ہوتا ہے اور جو حرکت نظر آتی ہے وہ آنکھ کا دھوکہ ہے اور یہی دھوکہ ان آلات کا کمال ہے:

کجی بھی کمال ہے مگر کمان کے لیے

سینما کی ابتدائی شکل

اگر ہم پیچھے لوٹ کر دیکھیں تو سینما کی ایک دلچسپ نظیر تاریخ میں ملتی ہے، جسے سینما کی ابتدائی اور سادہ شکل کہنا زیادہ مناسب ہے اور وہ ہے لالٹین کی روشنی میں پتلی تماشا۔ زمانہ قدیم سے لوگ اس تماشے سے لطف اندوز ہورہے تھے، مگر یہ تماشہ غیر مستقل ہوتا تھا اور ایک خاص ماحول تک محدود رہتا تھا۔ موجدوں نے اُسے مستقل کیا اور وسعت دی۔ آج کا سینما اسی پتلی تماشا کی جدید اور وسیع شکل معلوم ہوتا ہے۔

ہماری فقہی کتابوں میں ''صور الخیال'' کا ذکر ملتا ہے۔ ''صور الخیال'' کا تعارف موسوعہ فقہیہ میں اس طرح کرایا گیا ہے:

''فإنهم كانو يقطعون من الورق صوراً للأشخاص، ثم يمسكونها بعصى صغيرة و يحركونها أمام السراج فتنطبع ظلالها على شاشة بيضاء، يقف خلفها المتفرجون، فيرون ما هو في الحقيقة صورة الصورة''۔

ترجمہ: ....''اس لیے کہ وہ ورق سے اشخاص کی تصویریں کاٹ لیتے تھے، پھر اس کو چھوٹے چھوٹے ڈنڈے کے ذریعے روک لیتے تھے اور چراغ کے سامنے اس کو حرکت دیتے تھے، تو اس کا سایہ سفید پردہ پر ڈھل جاتا تھا، جس کے پیچھے تماشائی

کھڑے ہوتے تھے اور وہ چیز دیکھتے تھے جو درحقیقت تصویر کی تصویر ہوتی تھی‘‘۔

سینما اور ٹی وی کی تصاویر بھی اسی طرح دکھائی جاتی ہیں، فرق یہ ہے کہ ’’**صور الخیال** ‘‘ میں انداز بالکل سادہ تھا، اور اس تماشے سے لطف اندوز ہونے والے کم تھے، اور عکس ایک محدود ماحول میں ہی دیکھا جاسکتا تھا، اور اسے محفوظ اور مستقل کرنا ممکن نہ تھا، جب کہ آج جدید ترین الیکٹرانک مشینوں کے ذریعے ممکن ہوگیا ہے کہ پہلے جس کو صرف ایک پردہ پر دکھایا جاتا تھا، وہ آج بیک وقت لاکھوں پردوں پر شعاعوں کے ذریعہ منتقل کردیا جاتا ہے، دنیا بھر کے ناظرین اپنے گھروں میں بیٹھ کر اسے ملاحظہ کرسکتے ہیں۔ اسے آئندہ کے لیے محفوظ کرنا ممکن ہوگیا ہے، اور مشکل سے نہیں بلکہ آسانی سے، اور صرف قریب تک نہیں بلکہ بہت دور تک، اور طویل مدت میں نہیں بلکہ بہت قلیل وقت میں اس کا نشر و ارسال ممکن ہوگیا ہے۔

’’**صور الخیال**‘‘ ناجائز ہیں تو سینما اور ٹی وی کی تصویر بھی ناجائز ہونی چاہیے، کیونکہ دونوں میں فرق صرف قدیم اور جدید، سادہ اور ترقی یافتہ اور محدود اور وسیع کا ہے۔

’’**صور الخیال**‘‘ کے متعلق علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

’’... **كمثل صور الخيال التي يلعب بها ،لأنها تبقىٰ معه صورة تامة .**‘‘

ترجمہ: ... ’’جیسے خیال کی وہ تصویریں جن سے کھیلتے ہیں، کیوں کہ اس کے ساتھ مکمل تصویر باقی رہتی ہے (لہٰذا ناجائز ہے)‘‘۔ (۳)

روشنی... تصویر کا مادہ؟

ریل کے فیتے پر جو نقوش ثبت ہوتے ہیں، ان کے تصویر ہونے میں تو ہمارے ہاں کسی کا اختلاف نہیں، مگر ان نقوش میں سے روشنی گزار کر سامنے پردے پر جب ان کا عکس ڈالا جاتا ہے تو اکابر کی نگاہ میں وہ بھی تصویر ہے، حالانکہ پردے پر صرف روشنیاں پڑتی ہیں اور رنگ کی طرح اس پر قرار نہیں پکڑتی ہیں۔ پس اگر سینما کی تصویر روشنیاں ہونے کے باوجود تصویر ہے تو ٹی وی کی اسکرین پر نمایاں ہونے والی شکلوں کو بھی تصویر کہنا چاہیے، کیوں کہ:

۱۔ روشنی ہونے میں

۲۔ اور پائیدار اور ناپائیدار ہونے میں

۳۔ اور اپنے محل پر رنگ کی طرح قرار نہ پکڑنے میں، ٹی وی اور سینما کی تصویر برابر ہے۔

دونوں میں اگر فرق ہے تو صرف اس قدر ہے کہ ٹی وی میں روشنی کی کرنیں پیچھے سے پڑتی ہیں، جبکہ سینما میں سامنے سے ڈالی جاتی ہیں۔ یہ فرق کس قدر اہم ہے، اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ٹی وی کی اسکرین پر جس طرح روشنیاں چمکتی ہیں اور آن کی آن میں غائب ہوجاتی ہیں، یہی

حال سینما کی تصویر کا بھی ہے، مگر اکابر نے اس پہلو کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے، کیوں کہ ایسا انسانی صنعت کی بدولت ہوتا ہے۔ خودکار نظام جو انسان ہی کا تخلیق کردہ ہے، اس کے تحت خود بخود ایک منظر کی جگہ دوسرا منظر لے لیتا ہے۔ ڈیجیٹل اور غیر ڈیجیٹل کا فرق یہ ہے کہ ڈیجیٹل تکنیک میں پوری تصویر تبدیل نہیں ہوتی، بلکہ صرف مطلوبہ حصے میں جس میں حرکت ہو، وہاں تبدیلی ظاہر کردی جاتی ہے۔ ان سب کے باوجود انسان چاہے تو منظر کو روک سکتا ہے اور اسے سست روی سے بھی دیکھ سکتا ہے۔

علاوہ ازیں ان آلات کی وضع متحرک منظر نمائی کے لیے ہے، اگر ایک ہی تصویر اسکرین پر برقرار رہے تو ان آلات کا مقصد ہی فوت ہوجاتا ہے۔

سینما کے متعلق اکابر کا موقف

یہ کہنا کہ سینما کی نقل وحرکت بھی تصویر ہے، اکابر کی اکثریت اس پر متفق ہے۔ امداد الفتاویٰ میں ''**تصحیح العلم فی تقبیح الفلم**'' کے نام سے سینما کے ناجائز ہونے پر ایک مستقل رسالہ ہے، جس میں دیگر وجوہات کے علاوہ تصویر کو بھی سینما کی حرمت کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ امداد الفتاویٰ میں اس حوالے سے اور بھی فتاویٰ موجود ہیں، چند ایک ملاحظہ کیجئے:

> ''ازناچیز......سلام مسنون: یہ سینما کا کھیل تصاویر متحرکہ کا تماشا ہے، اس سے پہلے ایک قسم کا باجا بجایا جاتا ہے، اس کے بعد بجلی کے ذریعے سے تصاویر، متحرکہ کی جاتی ہے''۔ (۴)

ایک اور سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

> ''جواب: سینما میں جبکہ تصاویر محرمہ موجود ہیں، اور شیٔ محرم سے انتفاع وتلذذ ناجائز ہونا معلوم ہے، پھر سوال کی کیا گنجائش ہے؟ اور اس سے جو مقصود لکھا ہے، اولاً تو مقصود کی مشروعیت طریق کی اباحت کو مستلزم نہیں، پھر مقصود بھی کونسا ضروری ہے۔ اور باجے کا منضم ہونا اور بھی قبح کو بڑھا دیتا ہے''۔ (۵)

فلم بینی کی حرمت کی وجوہات ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''اس میں تصویروں کا استعمال اور ان سے تلذذ ہوتا ہے، اور اس کے قبح میں کسی کو کلام نہیں، گو عابدین ہی کی تصاویر ہوں۔ حضور ﷺ نے حضرت ابراہیم وحضرت اسماعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام کی تمثال جو بیت اللہ کے اندر بنائی گئی تھیں، ان کے ساتھ جو معاملہ فرمایا ہے، معلوم ہے''۔ (۶)

گھر میں ٹیلی ویژن رکھنے کے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے حضرت مفتی عبدالرحیم لاجپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''ٹیلی ویژن لہو ولعب اور گانے بجانے کا آلہ ہے، اس میں جاندار تصاویر کی

بھرمار ہوتی ہے۔‘‘(۷)

فقیہ ملت مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمود صاحب نور اللہ مرقدہٗ ایک استفتاء کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں:

’’فلم ’’خانۂ خدا‘‘ کا دیکھنا اسی طرح حرام ہے، جس طرح کہ دوسری فلمیں۔ دراصل سینما یورپ کی بے حیا اور عریاں تہذیب کی اشاعت کا سب سے بڑا اور مؤثر ذریعہ ہے۔ فلم ’’خانۂ خدا‘‘ میں یہ تمام شرعی محرمات موجود ہیں، اس لیے اس کا دیکھنا حرام ہے۔ بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا کیے گئے ہیں کہ اس فلم سے حج اور زیارت کی ترغیب ہوتی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ محرمات شرعیہ کا ارتکاب کر کے حج کی ترغیب دینی جائز نہیں ہوسکتی۔ اسلامی تعلیم میں حرام کو خیر کا فریضہ نہیں بنایا جاسکتا‘‘۔(۸)

ایک اور سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

سوال:...... کیا فرماتے ہیں علماء دین اندریں مسئلہ کہ آج کل ایک فلم موسومہ ’’اللہ اکبر‘‘ کا بہت چرچا ہے، کہا جاتا ہے کہ اس میں تمام ممنوعات شرعیہ سے احتراز کیا گیا ہے۔ اندریں حالات اس کا دیکھنا جائز ہے یا ناجائز؟ نیز عدم جواز حقیقی ہے یا کہ اضافی یعنی محلی؟

جواب:..... ناجائز ہے، اس لیے کہ اس میں لوگوں کی تصویریں وغیرہ دکھائی جاتی ہیں۔ اگر صرف مقام مقدسہ کی زیارت کرائی جاتی ہو تو اس میں قباحت نہیں ہے۔(۹)

مزید ملاحظہ کیجئے:

’’الجواب:..... کوئی فلم اور سینما تصویروں سے خالی ہوتا ہی نہیں، بلکہ فحش اور مخرب اخلاق تصاویر جتنی زیادہ ہوں لوگ اس میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ یہ فلم ’’اللہ اکبر‘‘ بھی تصاویر سے بھرپور ہے....(۱۰)

خیر الفتاویٰ میں حضرت اقدس مولانا خیر محمد جالندھریؒ کا جواب درج ذیل الفاظ کے ساتھ منقول ہے:

’’.... پھر کوئی فلم عورتوں اور مردوں کی تصویرات سے خالی نہیں ہوسکتی، ساز وآواز بھی اس کے لیے لازم ہے، جنہیں شریعت مطہرہ نے حرام قرار دیا ہے۔ احکام خداوندی توڑ کر محرمات شرعیہ کا ارتکاب کرتے ہوئے تبلیغ کا دعویٰ غضب خداوندی کو دعوت دینا ہے۔‘‘(۱۱)

شہید حق حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ کا نقطۂ نظر ملاحظہ کیجئے:

’’ہماری شریعت میں جاندار کی تصویر حرام ہے اور آنحضرت ﷺ نے اس پر لعنت

فرمائی ہے، ٹیلی ویژن اور ویڈیو فلموں میں تصویر ہوتی ہے۔ جس چیز کو حضور ﷺ حرام اور ملعون فرمارہے ہوں، اس کے جواز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' (۱۲)

مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ اپنے رسالہ ''تصویر کے شرعی احکام'' میں لکھتے ہیں:

مسئلہ: اس بیان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سینما کا دیکھنا اگر دوسری خرابیوں سے قطع نظر بھی کی جائے تو اس کی ممانعت کے لیے صرف یہ کافی ہے کہ اس میں تصاویر دکھلائی جاتی ہیں۔ پھر جب حالات پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اس سے بھی زیادہ بہت سے منکرات ومحرمات خود عمل میں آجاتے ہیں اور بہت سے معاصی کے لیے اس کا دیکھنا سبب قریب بنتا ہے۔ اس لیے اس تماشے کا دیکھنا دکھلانا سب حرام ہے... الی آخرہٖ۔ (۱۳)

قدیم اور جدید کا فرق

اس عنوان کے تحت قانونِ ارسطو کے ذریعہ قدیم اور جدید کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے، مناطقہ کے علاوہ فقہاء بھی اُسے ذکر کرتے ہیں، اس لیے اس سے کام لینے میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا ہے۔

تصویر کے مسئلے میں سب سے پہلے مصور کے ذہن میں خاکہ آتا ہے، جسے وہ قلم یا برش کے ذریعہ کاغذ وغیرہ پر اتارلیتا ہے اور اگر وہ سنگ تراش ہے تو اوزار کی مدد سے بت تراش لیتا ہے، اگر آرٹسٹ ہے تو کینوس پر رنگ بکھیر کر اپنے ذہنی خاکے کو رنگوں کی زبان میں محسوس کرادیتا ہے۔ کیمرے کی ایجاد نے قلم اور برش اور رنگ وروغن سے بے نیاز کردیا ہے، اب کیمرا اِن کاموں کو بہت سرعت اور سہولت اور نہایت نفاست اور خوبی کے ساتھ انجام دیتا ہے۔ گویا دونوں میں فرق آلے کا ہے۔ لیکن اس فرق کو غیر اہم قرار دے کر فوٹو کو تصویر کہا گیا ہے۔ مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ لکھتے ہیں کہ:

'' یہ منطق سمجھ سے بالا ہے کہ انسان ہاتھ سے کوئی کام کرے وہ تو حرام ہو اور وہی کام مشین سے لینے لگے تو وہ حلال ہوجائے۔''

دوسرا فرق مادے کا ہے۔ رنگ وروغن کی جگہ روشنی کے نقطوں نے لے لی ہے اور کاغذ اور کپڑے کی بجائے اب ٹی وی اور مانیٹر کی اسکرین استعمال ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ علت مادی میں بھی تبدیلی آئی ہے، مگر یہ فرق بھی جوہری اور بنیادی نہ ہونے کی وجہ سے نظرانداز کیا جائے گا، کیونکہ علت مادی کا فرق غیر مقصود ہونے کی بناء پر کوئی قابل لحاظ فرق نہیں ہوتا ہے۔ اگر مادے کا فرق حکم میں اثر کرتا تو چار حرام شرابوں کے علاوہ بقیہ شرابیں جائز ہونی چاہئے تھیں۔ یہ غیر معقول معلوم ہوتا ہے کہ کوئی الیکٹرانک آلہ ڈیٹا کو تصویر میں تبدیل کرکے روغنی کاغذ پر ظاہر کردے تو وہ تصویر کہلائے اور وہی آلہ اسی مواد کو تصویر میں بدل کر اسکرین پر نمایاں کردے تو اسے تصویر نہ کہا

جائے۔ یہ فرق حقیقت کا فرق نہیں ہے، بلکہ مادے کا فرق ہے اور ہر مادے کے اپنے خواص ہوتے ہیں۔ رنگ کا خاصہ قائم اور پائیدار ہونا ہے، جب کہ روشنی اس طرح قائم اور پائیدار نہیں ہوتی، جس طرح رنگ ہوتا ہے، مگر اپنی نوعیت کے مطابق ضرور پائیدار ہوتی ہے۔

علت صوری میں ہاتھ سے بنائی ہوئی اور کیمرے سے اتاری گئی دونوں برابر ہیں، بلکہ کیمرے کو کئی وجوہ سے برتری حاصل ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کیمرے کے ذریعے صورت گری میں تصور اور تخیل کو دخل نہیں ہوتا ہے، مگر جب شریعت جان دار کے ظاہری نقش ونگار اور خط وخال کو ہی تصویر کہتی ہے تو یہ اعتراض بھی وزن کھو دیتا ہے۔

علت غائی کا ذکر رہ گیا ہے۔ انسان کو آمادہ کرنے والی اور کسی فعل پر ابھارنے والی علت غائی ہوتی ہے۔ یہ محرک اور باعث کا کام دیتی ہے۔ چاروں علتوں میں علت غائی ہی اصل علت اور ''**علة العلل**'' ہوتی ہے، کیونکہ حکم کے لیے مدار یہی علت بنتی ہے۔ ''**الأمور بمقاصدها**'' میں علت غائی کا ہی بیان ہے۔ یہ علت ہاتھ کے ذریعے صورت سازی اور کیمرے کے ذریعے منظر کشی، دونوں میں یکساں ہے۔ دونوں کا مقصد اصل کی نقل وحکایت ہے اور دونوں سے مقصود اصل کا ''بصری ریکارڈ'' محفوظ رکھنا ہے۔

حواشی وحوالہ جات

(۱) ماہنامہ بینات، ذوالحجہ ۱۳۸۹ھ بمطابق فروری ۱۹۷۰ء۔
(۲) ملاحظہ کیجیے: تصویر کے شرعی احکام، ص: ۶۱، ط: ادارۃ المعارف، سن: ۲۰۰۵ء۔
(۳) از رسالہ ''بحث ونظر'' مع زیادۃ وتغییر، راشد حسین ندوی، دعوتی وتبلیغی مقاصد کے لیے الیکٹرانک ذرائع کا استعمال۔
(۴) امداد الفتاویٰ، کتاب الحظر والاباحۃ، غناء مزامیر اور لہو ولعب وتصاویر کے احکام، ۴/۲۵۷، ط: دار العلوم کراچی۔
(۵) ایضاً۔
(۶) امداد الفتاویٰ، مسائل شتی، ۴/۳۸۶، ط: دار العلوم کراچی۔
(۷) فتاویٰ رحیمیہ، کتاب الحظر والاباحۃ، باب التصویر، ۱۰/۱۴۷، ط: دار الاشاعت۔
(۸) فتاویٰ مفتی محمود، باب الحظر والاباحۃ، ۱۰/۲۲۰، جمعیت پبلی کیشنز۔
(۹) فتاویٰ مفتی محمود، باب الحظر والاباحۃ، ۱۰/۴۵۲، ط: جمعیت پبلی کیشنز۔
(۱۰) فتاویٰ مفتی محمود، باب الحظر والاباحۃ، ۱۰/۴۵۲، ط: جمعیت پبلی کیشنز۔
(۱۱) خیر الفتاویٰ، ما یتعلق بالانبیاء والصلحاء، ۱/۲۳۰، ط: خیر المدارس۔
(۱۲) آپ کے مسائل اور ان کا حل، فلم دیکھنا، ۸/۴۳۴ ط: مکتبہ لدھیانوی۔
(۱۳) تصویر کے شرعی احکام، ص: ۹۰، ط: ادارۃ المعارف کراچی۔

(جاری ہے)

قدیم اور جدید معاشی نظریات کا تعارف

(تیسری اور آخری قسط)

مفتی عارف محمود

اشتراکیت (Socialism)

سوشلزم جسے اردو میں ''اشتراکیت'' اور عربی میں ''الاشتراکیة'' کہتے ہیں، درحقیقت سرمایہ دارانہ نظام کے ردعمل کے طور پر وجود میں آیا، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اس نے سرمایہ دارانہ نظام کے بنیادی فلسفے کو چیلنج کرتے ہوئے یہ ماننے سے انکار کیا کہ معیشت کے بنیادی مسائل محض ذاتی منافع کے محرک، شخصی ملکیت اور رسد وطلب کی قوتوں کی بنیاد پر حل کیے جاسکتے ہیں۔

اشتراکیت ان تمام خرابیوں کے سدباب کا دعویٰ لے کر میدان میں آئی، جو سرمایہ دارانہ نظام کے مرہونِ منت تھے۔ اشتراکیت نے سرمایہ داریت کے بنیادی فلسفے انفرادیت کو رد کرتے ہوئے اجتماعیت اور جماعت کا نظریہ پیش کیا اور کہا کہ جماعت ہی سب کچھ ہے، فرد کچھ نہیں، لہٰذا وسائل پیداوار کو فرد کی ملکیت قرار دینا درست نہیں، بلکہ حکومت ہی تمام وسائل پیداوار کی مالک ہے۔ اس کو یہ علم ہوگا کہ کل وسائل کتنے ہیں؟ معاشرے کی ضروریات کیا کیا ہیں؟ لہٰذا وہی تمام زرعی، صنعتی اور تجارتی پالیسیاں بنانے اور نافذ کرنے کی مجاز ہے، وہی افراد کے پیشے معین کرنے کا حق رکھتی ہے، گویا وسائل کی تخصیص، ترجیحات کا تعین اور ترقی کے تینوں کام حکومت کی منصوبہ بندی کے تحت انجام پائیں گے۔ جہاں تک آمدنی کی تقسیم کا معاملہ ہے، تو اشتراکیت کا کہنا ہے کہ حقیقت میں عامل پیداوار صرف زمین اور محنت ہیں۔ زمین انفرادی ملکیت نہیں، بلکہ حکومت کی ملکیت ہے، تو اس کا لگان دینے کی ضرورت نہیں۔ رہی محنت تو اس کی اجرت کا تعین بھی حکومت اپنی منصوبہ بندی کے تحت کرے گی۔ گویا ان کے نزدیک بھی معاشی مسائل کا ایک ہی حل ہے اور وہ حکومتی منصوبہ بندی ہے، اسی وجہ سے اُسے منصوبہ بند معیشت (Planned Economy) بھی کہا جاتا ہے۔

اشتراکیت سے بحث کرنے والے حضرات نے اس کی تین بڑی قسمیں بیان کی ہیں:

۱:......قدیم اشتراکی نظریات

۲:......ارتقائی، یا معاشی اشتراکیت

۳:...... مارکس کی انقلابی اشتراکیت (یورپ کے تین معاشی نظام،ص:۴۸،ادارۃ المعارف کراچی)

ہم یہاں ان کی تفصیلات سے تعرض نہیں کریں گے، البتہ اشتراکیت کے بنیادی اصولوں پر ایک نگاہ ضرور ڈالیں گے، تاکہ اس کی پوری حقیقت کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

اشتراکیت کے چار بنیادی اصول

۱:......اجتماعی ملکیت (Collective Property)

اس اصل کا حاصل یہ ہے کہ وسائل پیداوار قومی ملکیت میں ہوں گے اور حکومت کی منصوبہ بندی کے تحت استعمال ہوں گے۔ ذاتی استعمال کے علاوہ وسائل پیداوار پر کوئی ذاتی ملکیت نہیں ہوگی، حکومت وقت ہی قومی نمائندہ کی حیثیت سے ان کی مالک ہوگی۔

۲:......منصوبہ بندی (Planning)

اس نقطہ نظر کا خاصہ یہ ہے کہ تمام معاشی مسائل کا حل اور فیصلے حکومتی منصوبہ بندی کے تحت کیے جائیں گے۔ حکومت ہی یہ فیصلہ کرے گی کہ کون سے وسائل کہاں اور کتنی مقدار میں لگائے جائیں؟ اور محنت کرنے والوں کی کیا اجرت مقرر کی جائے؟ غرض اس میں ہر معاشی فیصلہ سرکاری منصوبہ بندی کے تابع ہوتا ہے۔

۳:......اجتماعی مفاد (Collective interest)

اس نظام میں حکومتی منصوبہ بندی کے تحت اجتماعی مفاد کو مرکزی اور کلیدی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

۴:......آمدنی کی منصفانہ تقسیم(Equitable Distributian of Income)

امیر اور غریب کے درمیان موجود فاصلوں کو کم کرنے کے لیے یہ اصول پیش کیا کہ جو کچھ بھی آمدنی حاصل ہو وہ افراد کے درمیان منصفانہ طور پر تقسیم ہو، عملاً ایسا ہوا یا نہیں؟، یہ ایک الگ بحث ہے، البتہ اشتراکیت میں کم از کم یہ دعویٰ ضرور کیا گیا کہ اس نظام میں تنخواہوں اور اجرتوں کے درمیان تفاوت بہت زیادہ نہیں ہے۔

معاشرے پر اشتراکیت کے اثرات

اشتراکیت صرف معاشی یا سیاسی نظام نہیں، بلکہ یہ ایک مستقل فلسفہ، مرتب، مربوط اور تمام مذاہب سے مختلف ایک الگ نظریۂ حیات ہے، جو سیاست ومعیشت، اخلاق ومعاشرت، مابعد الطبعی

تخیلات وعقائداور انسانی زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی کا مدعی ہے۔

کارل مارکس(Karl Marx) نے جو ایک ٹھیٹ یہودی خاندان سے تعلق رکھتا تھا، اور ساری عمر احساس محرومی کا شکار رہا، اپنے ساتھی فریڈرک اینجلز کے ساتھ مل کر اشتراکیت کے نام سے جو فلسفہ مرتب کیا، اس میں دو چیزیں نمایاں ہیں:

۱:......سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف نفرت وبغاوت۔

۲:......دین ومذہب کی حقارت، بیزاری اور عداوت۔

اس فلسفے کی روسے ''اشتراکی حکومت'' ایک ایسی آمریت اور ڈکٹیٹر شپ ہے، جو نہ خدا کے سامنے جوابدہ سمجھی جائے، نہ عوام کے سامنے، جو کسی مذہب کی پابند ہو نہ اخلاق کی، آئین کی پابند ہو نہ قانون کی، اس مطلق العنان ڈکٹیٹر شپ نے فرد کے ساتھ وہ سلوک کیا جو کسی مشین کے بے جان پرزے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ پیشے اور اظہار رائے کی آزادی اور انفرادی ملکیت چھین کر اس کو اتنا گھونٹ دیا کہ اس کی فطری آزادی بھی سلب ہوکر رہ گئی۔

رسد وطلب کے قدرتی قوانین کا انکار کرکے اس کی جگہ حکومتی منصوبہ بندی کو ہر مرض کا علاج قرار دیا، حالانکہ انسانی زندگی اور معاشرے کو سینکڑوں ایسے مسائل درپیش رہتے ہیں، جس میں انسان کی وضع کی ہوئی منصوبہ بندی ناکام ہوجاتی ہے، اور اس منصوبہ بندی کے نتیجے میں فرد ومعاشرہ ایک غیر فطری اور مصنوعی نظام کے جال میں پھنستا چلا جاتا ہے اور وسائل چند برسراقتدار افراد کے قبضے میں چلے جاتے ہیں۔ ذاتی منافع کے محرک کو ختم کردینے سے فکروعمل دونوں میں سستی اور کاہلی کے جراثیم پیدا ہوجاتے ہیں، اور لوگ ظالم و جابر حکومتوں کے ایسے شکنجوں میں پھنستے ہیں، جہاں کسی کو پھڑ پھڑانے اور چیخنے چلانے کی آزادی بھی حاصل نہیں ہوتی۔

اشتراکیت نے دنیا کو کیا دیا؟

اشتراکیت نے دنیا کو کیا دیا؟ خود اس کے سب سے بڑے داعی اور مرکز روس جو سویت یونین کہلاتا تھا، اس کے خاتمے کے موقع پر اُس کے صدر یلسن نے کہا:''کاش! اشتراکیت (UTOPAIN) نظریے کا تجربہ روس جیسے عظیم ملک میں کرنے کی بجائے افریقہ کے کسی چھوٹے رقبے میں کرلیا گیا ہوتا، تاکہ اس کی تباہ کاریوں کو جاننے کے لیے چوہتر(۷۴) سال نہ لگتے۔'' اسی طرح مشرقی جرمنی میں لوگوں نے دیوار برلن کو توڑ کر اشتراکیت کی ناکامی کا عملاً اعتراف کیا۔

سرمایہ دارانہ نظام کے اثرات

اشتراکیت کے زوال اور ناکامی کے بعد سرمایہ دار ممالک نے بڑی شدومد سے یہ پروپیگنڈا

کیا کہ سوشلزم کی ناکامی ان کی کامیابی کی دلیل ہے، جب کہ حقیقت میں اشتراکیت کے زوال کا سبب سرمایہ دارانہ نظام کی حقیقی غلطیوں کی اصلاح کی بجائے غلط لائحہ عمل کا اختیار کرنا تھا، جس پر ہم گزشتہ صفحات میں گفتگو کرچکے ہیں۔ اب یہاں سرمایہ داریت کے بنیادی اصول ذاتی منافع کے محرک کو کھلی چھوٹ دینے اور خود اس نظام کے نتیجے میں جو خرابیاں سرمایہ دار معاشرے میں پیدا ہوئیں اور ملک وقوم پر اس کے جو مہلک اثرات پڑتے ہیں، ان کا خلاصہ پیش خدمت ہے:

۱:...... مذہب کو نظام سیاست ومعیشت سے الگ کر کے گرجاؤں، مسجدوں اور خانقاہوں تک محدود کردیا جاتا ہے، تاکہ وہ ان کی ناجائز نفع اندوزی میں رکاوٹ نہ بن سکیں۔

۲:...... ذاتی منافع کے محرک کو بے لگام چھوڑنے کی وجہ سے یہ اکثر لوگوں کے سفلی جذبات کو ہوا دے کر ان کی غلط خواہشات کی تسکین کا سبب بنتا ہے۔ منافع کے حصول کے لیے حلال وحرام میں کوئی تفریق نہ ہونے کی وجہ سے لوگ نفع کمانے کے لیے ایسے ذرائع کو اختیار کرتے ہیں، جن سے معاشرے میں اخلاقی بگاڑ پھیلتا ہے، چنانچہ مغربی ممالک میں عریانی اور فحاشی کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے۔

۳:...... اس نظام میں تجارت وصنعت اور دولت کی گردش سود، قمار، اور آڑھت کی بنیادوں پر ہوتی ہے، حالانکہ ان کی وجہ سے معیشت کے فطری توازن میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ پورے ملک کے وسائل پیداوار اور دولت کے تمام خزانے چند ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کے ہاتھ میں سمٹ کر جمع ہوجاتے ہیں، رسد وطلب کے فطری قوانین مفلوج ہوجاتے ہیں، شخصی اجارہ داریوں کی وجہ سے اشیاء کی قیمتوں کا نظام متوازن نہیں رہتا اور ایک مصنوعی نظام وجود میں آجاتا ہے، جس کے بے رحم شکنجے میں پھنس کر پورا معاشرہ دردناک عذاب میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

۴:...... بڑے سرمایہ دار اور تاجر عملاً پورے نظام تجارت پر قابض ہوجاتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے تاجروں کو اس قابل نہیں چھوڑتے کہ وہ اپنے کاروبار کو ترقی دے سکیں، یا باقی رکھ سکیں۔ چھوٹے پیمانے پر کاروبار کرنے والے روز بروز کم ہوتے جاتے ہیں، یا بڑے سرمایہ داروں کی تجارتی پالیسیوں کے تابع محض ہوکر زندگی گزارنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔

۵:...... سرمایہ داروں اور نوکر شاہی کے گٹھ جوڑ سے سرمایہ دارانہ حکومتیں اپنے ہی اصول ''عدم مداخلت (Laissez Faint)'' سے انحراف کر کے مختلف قوانین اور ناجائز ٹیکسوں کے ذریعے کسی تجارت کی ہمت افزائی اور کسی کی حوصلہ شکنی کرتی رہتی ہیں، جس کا فائدہ صرف بااثر سرمایہ داروں کو پہنچتا ہے۔

۶:...... اس نظام میں غریب غریب تر اور امیر اور سرمایہ دار کی دولت میں بڑھوتری اور روزانہ اضافہ ہونے کی وجہ سے وہ امیر تر ہوتے جاتے ہیں۔ معیار زندگی کو اتنا بلند کردیا جاتا ہے کہ متوسط اور سفید پوش طبقہ اس کا ساتھ نہیں دے پاتا، جس سے اَن گنت معاشرتی الجھنیں اور بے شمار معاشی ناہمواریاں پیدا ہوجاتی ہیں۔

۷:......سرمایہ دارانہ نظام میں تقسیم دولت کا نظام ناہمواری کا شکار ہوجاتا ہے۔ سود اور قمار پر مبنی اس نظام کی وجہ سے ملک کی کل آبادی دو طبقوں میں بٹ جاتی ہے۔ دولت کے بہاؤ کا رخ امیروں اور سرمایہ داروں کی طرف رہتا ہے، غریبوں اور مزدوروں کی طرف نہیں ہوتا، اسی وجہ سے سرمایہ دار اور مزدور کی طبقاتی کشمکش کا آغاز ہوتا ہے۔

۸:......ملوں اور فیکٹریوں کی اجارہ داری کی وجہ سے گھریلو صنعتوں اور دستکاریوں سے تیار ہونے والا مال ان کی پیداوار اور سیلنگ ریشو(Saling Ratio) کا مقابلہ نہیں کرپاتا، دستکار اپنا پیشہ چھوڑ کر مزدوری اور ملازمت کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں، جس کی وجہ سے گھریلو صنعتیں اور دستکاریاں زوال پذیر ہوجاتی ہیں۔

۹:......ملازمت اور مزدوری کے طلب گاروں میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ مشینوں کے روز افزوں استعمال کی وجہ سے انسانی کھپت میں کمی آجاتی ہے، جس سے پورے ملک میں بے روزگاری کا طوفان برپا ہوجاتا ہے، نتیجتاً مزدور کم سے کم اجرت پر مشکل اور ہر طرح کا محنت طلب کام بھی کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔

۱۰:......سرمایہ دار طبقہ اپنے سرمایہ کے زور سے حکومتی پالیسی کو اپنی حکمت عملی کے تابع کرلیتا ہے۔ مارکیٹ میں وہی اشیاء لائی جاتی ہیں جس سے سرمایہ دار کا زیادہ سے زیادہ نفع ہوتا ہے۔ ملک وقوم کا کوئی فائدہ ان کے پیش نظر نہیں ہوتا۔ یہ نظام پوری سوسائٹی اور اس کے تمدن کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے، صرف مال دار ہی ہر عزت وشرافت کا معیار بن جاتا ہے۔ علم، عقل اور اعلیٰ اخلاق کی بجائے انسان کی قدر ومنزلت اس کے بینک بیلنس سے پہچانی جاتی ہے۔ مادیت پرستی اور کمانے کا ایسا دھن لوگوں پر سوار ہوجاتا ہے کہ وہ خود غرضی، سنگدلی، عیاشی اور اخلاقی طور پر دیوالیہ پن کا شکار ہوجاتے ہیں۔

(مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: ''اسلام اور جدید معاشی مسائل اور یورپ کے تین معاشی نظام'')

خلاصہ یہ کہ یہ پورا نظام سرمایہ دار کے سرمایہ میں اضافے کا ایک آلہ ہے۔ سود کے اس نظام میں پوری قوم کے سرمائے کو چند بڑے سرمایہ دار اپنے مفاد میں استعمال کرتے ہیں، اور اس کے بدلے قوم کو بہت تھوڑا سا حصہ واپس کرتے ہیں، اور یہ تھوڑا سا حصہ بھی اشیاء کی لاگت میں شامل کرکے دوبارہ عام صارفین ہی سے وصول کرلیتے ہیں اور اپنے نقصان کی تلافی بھی عوام کی بچتوں سے کرتے ہیں، اور اس طرح سود کا مجموعی رخ اس طرف رہتا ہے کہ عوام کی بچتوں کا اصل کاروباری فائدہ بڑے سرمایہ داروں کو پہنچے اور عوام اس سے کم سے کم مستفید ہوں، اس طرح دولت کے بہاؤ کا رخ ہمیشہ اوپر کی طرف رہتا ہے۔ (معاشی نظام، ڈاکٹر محمد آدم ایڈوکیٹ، ص:۱۱۵، ادارہ فروغ ادب کراچی)

سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) کی حقیقت

قارئین کرام! یہ ہے وہ سرمایہ دارانہ نظام جس میں ''Accumulation of wealth'' دولت کی اس ریل پیل سے معاشرے اور انسانی گروہوں کو کنٹرول کیا جاتا ہے، جبکہ دولت کا بہاؤ ہر حال میں عوام الناس سے خاص الخواص (سرمایہ داروں) کی جانب ہی رہتا ہے۔ سب سے نچلی سطح پر عوام الناس اور ان کے متعلقین ہیں، خواہ ان کا تعلق زراعت، صنعت وحرفت، تجارت، ٹریڈنگ یا سروس وغیرہ کسی بھی شعبے سے ہو۔ یہ لوگ ایک ہی لگی بندھی آمدنی کا طبقہ کہلاتے ہیں، اور یہ دولت بصورتِ جنس یا خدمت کے پیداوار کرکے اپنے سے اوپر والی سطح پر پہنچاتے رہتے ہیں، اور ان کا اپنے معاوضوں پر قطعی کوئی اختیار نہیں ہوتا، بلکہ اوپر والے سرمایہ داران کے لیے جو بھی معاوضہ مقرر کریں، یہ اس پر اکتفاء کرنے پر مجبور ہیں۔

اب اوپر والی سطح کے لوگ مختلف ذرائع سے اپنی دولت بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں، سطح در سطح یہ عمل انجام پاتے چلا جاتا ہے اور نتیجے میں چند مخصوص اشخاص کی عوام الناس پر کلی طور سے اجارہ داری قائم ہوجاتی ہے۔ ان معاملات میں سب سے اہم رول کمپنیوں اور بینکوں کا ہوتا ہے، جن کی روح رواں وہ سودی نظامات ہیں، جن کے تحت یہ چلتے ہیں، خواہ ان کا نام کچھ بھی ہو۔ دوسری طرف ریاستی محصولات کی مد میں ٹیکسوں کا ایک ایسا نظام enforce کیا جاتا ہے، جن کا منتہائے مقصود بینکوں میں رائج سودی نظام کو تقویت دینے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

چور معاشرہ کی تشکیل

بہر حال خواہ وہ کمپنیاں ہوں، یا بینکاری اور حکومتی ٹیکس، سب کا مقصد ناجائز دولت سمیٹنا ہوتا ہے، اگرچہ ان کے طریقۂ واردات میں کچھ فرق ہو۔ سرمایہ دار عوام الناس سے دولت بٹورتا ہے، جبکہ دوسری طرف حکومت ان سے ناجائز حد تک ٹیکس وصول کرتی ہے۔ اب سب کے پاس اس نظام کے نتیجے میں ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے، اور وہ ہے چوری کا راستہ۔

ایک عام آدمی سے لے کر سرمایہ دار اور سربراہانِ مملکت تک سب کسی نہ کسی سطح اور صورت میں کمائی کے ناجائز اور چور دروازے تلاش کرتے ہیں۔ ان ساری تفصیلات کے بعد ہم یہ فیصلہ قاری پر چھوڑتے ہیں کہ کیا ایسا نہیں کہ اس نظام کا حاصل ایک ایسا معاشرہ ہے جس میں سودی نظام کے سایہ تلے چوری کا ایک خاص امتیازی مقام حاصل ہو؟!۔

اب ایسے نظام میں عدل وانصاف کو تلاش کرنا اور اس کے ذریعے انسانی معاشرے کی تعمیر وترقی کے بلند وبانگ دعوے کرنا نری حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟!۔

☆☆☆

الرزاق جل جلالہٗ

ڈاکٹر محمد اشرف کھوکھر

اگرچہ زمانۂ تخلیق کو ناپنے کا کوئی آلہ موجود نہیں ہے، تاہم سائنسدانوں کی قیاس آرائی کے مطابق انسان کو اپنی موجودہ شکل وصورت میں اس کرۂ ارض پر وجود میں آئے تقریباً دس ہزار سال گزر رہے ہیں۔ وہ شروع دن سے خوراک، مکان اور تلاشِ رزق میں صحرانوردی کی زندگی بسر کرتا رہا۔ جب بھی ''حصول رزق'' کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل ہوئی، اس نے انسانی خون بہانے سے دریغ نہیں کیا۔ اس صورت حال کا ذکر قرآن مجید میں اللہ رب العزت اور فرشتوں کے مابین مکالمے کے انداز میں موجود ہے۔ تخلیق انسان کے بارے میں فرشتوں نے دریافت کیا تھا:
''اے رب العالمین! کیا تو ایسی ہستی کو پیدا کرنا چاہتا ہے جو کرۂ ارض پر ہر روز ایک نیا ہنگامہ کھڑا کرے گی اور خون بہانے سے باز نہیں آئے گی''۔ (سورۂ بقرہ)

یہاں ہمارا مقصود تخلیق انسان کی تشریح نہیں، بلکہ رزق اور حصول رزق کے لیے کی گئی انسانی تگ ودو، جستجو، کوشش، جہد مسلسل اور اللہ تعالیٰ کی صفتِ ''رَزَّاق'' کو بیان کرنا ہے۔

اللہ رب العزت نے بے شمار مخلوقات کو پیدا فرمایا اور انسان کو اشرف المخلوقات بنایا، انسان کو کرۂ ارض پر بھیجنے سے پہلے ''الرزاق جل جلالہٗ'' نے فراہمی رزق کا انتظام فرمادیا۔

بچہ ابھی شکم مادر میں نہیں آیا ہوتا کہ الرزاق جل جلالہٗ نے اس کے رزق کا انتظام پہلے سے کردیا ہوتا ہے۔ بحکم خالق جب بچہ کی پیدائش ہوجاتی ہے تو مادرمہربان کے سینے میں اس کی فطری ضرورت کے مطابق دودھ کی نہریں ننھے منے بچے کو بہترین رزق فراہم کرتی ہیں۔ جب ذرا بڑا ہوتا ہے، ماں باپ کی شفقت ومحبت کے نتیجے میں خوراک اور فراہمی رزق کا بہترین انتظام فرمادیتا ہے۔

ہرن کے بچے کو دیکھئے! پیدائش سے تھوڑے ہی وقفے کے بعد اپنے پاؤں پر کھڑا ہوجاتا ہے اور تھوڑی ہی دیر میں اپنی ماں کے تھنوں سے دودھ پینا شروع کردیتا ہے۔ اللہ رب العزت نے کیسی من موہنی جبلی خصوصیات سے نوازا ہے۔ اسی طرح دیگر حیوانات کا معاملہ ہے۔ الرزاق جل

جلالہ ہی اپنی مخلوقات کے رزق کا ذمہ دار اور اپنے فضل و احسان کے طور پر اپنے بندوں تک رزق پہنچانے اور اسباب پیدا کرنے والا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

’’إِنَّ اللّٰہَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُوْ الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ‘‘۔ (الذاریات:۵۷)

ترجمہ:..’’اللہ تعالیٰ تو خود ہی سب کو روزی پہنچانے والا ہے، قوت والا مضبوط ہے‘‘۔

ندی نالوں، دریاؤں اور سمندروں کی سطح آب سے آفتاب کی گرمی سے آبی بخارات کا اٹھنا، ہوا کے دوش پر سوار ہوکر بادلوں کی شکل اختیار کرنا، بحکم خدا متوازن قطرات بارش میں زمین پر رحمت خداوندی کا برسنا اور پھر زمین کے خزانوں کا اُگلنا، ایک بیج سے کونپل، کونپل سے پودا اور پودے سے پھول اور پھل یہ سب کے سب ’’الرزاق جل جلالہٗ‘‘ کے فراہمیٔ رزق کے اسباب ہی تو ہیں۔ بے شک اللہ ہی بہترین رزق دینے والا ہے۔

جو جاندار جہاں ہے، جس فطری ماحول میں ہے ’’الرزاق جل جلالہ‘‘ نے فراہمیٔ رزق کے اسباب بھی ویسے ہی پیدا کر دیئے ہیں۔ مچھلی کو اپنے فطری ماحول پانی میں رزق مہیا کرنے کے اسباب پیدا فرما دیئے ہیں، اسی طرح ایک زیر زمین رہنے والے کیڑے کو زمین کی تہوں میں رزق ملتا ہے اور اگر ایک کیڑا پہاڑ کی چوٹی میں برف کی سل کے اندر موجود ہوتا ہے تو الرزاق جل جلالہ اس کو وہاں رزق فراہم کرتا ہے۔’’سبحان اللّٰہ وبحمدہٖ سبحان اللّٰہ العظیم‘‘۔

اللہ رب العزت نے حصولِ رزق کی جبلی خصوصیات تو تمام جانداروں میں ودیعت کی ہیں۔کھانا، پینا فطری امور میں سے ہے: ’’فِطْرَةَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا‘‘۔انسان چونکہ اشرف المخلوقات ہے، اس لیے دیگر حیوانات کی طرح خالق فطرت نے اُسے آزاد نہیں چھوڑا ہے۔ زندگی کو آسان بنانے کے لیے جن چیزوں پر زندگی موقوف ہے، ان کی طرف رہنمائی بھی بذریعہ آسمانی ہدایت عطا فرمائی گئی ہے۔ انسانی حیات کی تعمیر وترقی کے لیے اسلام نے حدود وقیود، کمیت وکیفیت اور حلال وحرام کی تمیز بتائی ہے، منع نہیں فرمایا، بلکہ ناجائز طریقوں سے حاصل کیے گئے رزق کے استعمال سے نہ صرف منع فرمایا ہے، بلکہ وعیدیں سنائی گئی ہیں۔کمیونزم، سوشلزم اور دیگر مذاہب میں حلال وحرام کی بے اعتدالیوں کی وجہ سے اخلاقی دیوالیہ پن واقع ہوا ہے، جبکہ اسلام نے اس بے اعتدالی کی روک تھام کے لیے حلال وحرام کا فرق بیان کیا ہے۔

رزق کی اقسام:

رزق کی دو قسمیں ہیں:۱:......حلال۔۲:......حرام۔ پھر رزق حرام کی دو اقسام ہیں: ۱......**حرام لذاتہٖ**۔۲......**حرام لغیرہٖ**۔ مثلاً: بکری حلال ہے، لیکن اگر کوئی چوری کر کے ذبح کرے

اور خود کھائے یا دوسروں کو کھلائے تو وہ حرام ہوگی ۔ اگر کوئی شخص انتہائی مشقت سے کمائی ہوئی رقم سے اشیائے خورد ونوش حاصل کرتا ہے تو اس کے تمام اعمال واخلاق پر بہتر اثر پڑتا ہے ۔ رسول آخرین ﷺ نے فرمایا: ''الکاسب حبیب اللّٰہ'' ......یعنی ''محنت کار اللہ کا دوست ہوتا ہے''۔

اس کے برعکس اگر کوئی ناجائز ذرائع سے مثلاً: چوری، ڈاکہ، رشوت، دھوکہ فراڈ کے ذریعے سے رزق حاصل کرتا ہے تو اس کے لیے یہ حرام ہے اور اس کے اعتقادات، اعمال واخلاق، نماز، روزہ، حج ودیگر عبادات پر انتہائی برا اثر پڑے گا، یہ تمام عبادات اللہ رب العزت کے ہاں ناقابل قبول ہوں گی۔

اللہ رب العزت کی حلال کی ہوئی چیزیں غیر اللہ کے نام پر ذبح کرکے کھانا بھی حرام کے زمرے میں آتا ہے۔ شرع متین نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے تو ان کے حرام کیے جانے کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں، مثلاً: نجاست اور مردار کھانے کی وجہ سے جن جانوروں میں گندی اور قبیح عادات واطوار پیدا ہوتے ہیں تو انہیں انسان کے لیے کھانا حرام قرار دیا گیا ہے، تاکہ انسانی اخلاق حسنہ متاثر نہ ہوں۔

اسلام چونکہ مکمل ضابطۂ حیات ہے، اس لیے مادہ اور مادہ پرستی سے منع کرتا ہے۔ رزق حلال، تواضع وانکساری اور مسنون طریقوں سے کھانے، پینے کو باعث اجر وثواب قرار دیتا ہے۔ اسلام نے رزق حلال کے استعمال سے پہلے اور بعد میں اللہ تعالیٰ کا نام لینے کی تاکید فرمائی ہے، اس لیے کھانے، پینے کی ابتداء وانتہاء میں مسنون دعاؤں کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ انسانی صحت اور تندرستی کے لیے اعتدال کو مستحسن کہا گیا ہے۔ رسول آخرین ﷺ نے فرمایا: ''خیر الأمور أوسطھا''۔ ......یعنی ''ہر کام میں میانہ روی مستحسن ہے''۔

ہر شخص رزق کی جستجو اور تلاش میں حلال وحرام کی تمیز کیے بغیر سرگرم عمل ہے اور اس کے لیے ہر طرح کی ذلت ورسوائی برداشت کرنا آسان سمجھتا ہے، حالانکہ الرزاق جل جلالہ کے ارشاد کا ترجمہ یہ ہے کہ: ''زمین پر جو بھی چلنے والا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کا رزق (اپنی رحمت کے ساتھ) اپنے ذمے لے لیا ہے''۔ (ہود:٦)

انسانی صحت اور تندرستی کے لیے الرزاق جل جلالہ نے حدِ اعتدال کو ملحوظ رکھنا سکھایا ہے، مثلاً: روزہ میں مسلمان اللہ کی حلال کی ہوئی اشیاء اور رزق کے کھانے، پینے سے صرف اور صرف اللہ کی خوشنودی اور رضا جوئی کے لیے رک جاتا ہے۔ دنیا میں تمام بگاڑ کا سبب حصول رزق میں انسانی حرص کا حد سے تجاوز کرنا قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ جو لوگ جائز وناجائز کو ملحوظ رکھے بغیر اپنی تمام صلاحیتوں اور توانائیوں کو رزق، زن، زر اور زمین کے حصول کے لیے صرف کرتے ہیں اور شب وروز بے چین نظر آتے ہیں اور جو لوگ حصولِ رزقِ حلال میں محنت ومشقت سے کام لیتے

ہوئے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت وفرمانبرداری کرتے ہیں، ان کے لیے دنیا میں امن وسکون اور آخرت میں اجرعظیم ہوگا۔ بقول مولانا حالی:

مشقت کی ذلت جنہوں نے اٹھائی
جہاں میں ملی ان کو آخر بڑائی
نہال اس گلستان میں جتنے بڑھے ہیں
ہمیشہ وہ نیچے سے اوپر چڑھے ہیں

کسی بھی فرد، قوم اور ملک کی ترقی وخوشحالی' اقتصادی آسودگی کی مرہون منت ہے۔ جہاں ملکی اقتدار پر متمکن لوگ عوام الناس میں مواقع کی فراہمی میں بندر بانٹ کا معاملہ کریں، وہاں تعمیر وترقی کیسے ممکن ہو؟ جس ملک میں خوانین، جاگیرداروں، وڈیروں اور پدرم سلطان بود کے نعرے لگانے والوں کی کثرت ہو، جہاں غریب طبقہ کے محنت کش افراد مذکورہ طبقات کے غلام ہوں، جہاں مزدوری نہ ملے، اگر ملے تو پوری نہ ملے، حصول رزق حلال کی تگ ودو، کوشش اور جہد مسلسل کو سبوتاژ کردیا جائے، وہ قوم وملک بھلا کیسے تعمیر وترقی کی اوج ثریا تک پہنچ سکتے ہیں؟ اللہ رب العزت ''الرزاق جل جلالہٗ '' ہے اور رزق کی فراہمی کا نہ صرف وعدہ کیا ہے، بلکہ فرش خاکی کو رزق حلال سے مزین کررکھا ہے۔ رہی حصول رزق میں توکل کی بات تو صرف ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ جانا توکل نہیں کہلاتا، توکل علی اللہ کا مطلب یہ ہے کہ:

توکل کا یہ مطلب ہے کہ خنجر تیز رکھ اپنا
انجام اس کی تیزی کا مقدر کے حوالے کر

اسلام میں حصول رزق حلال کو عین عبادت کہا گیا ہے، رسول آخرین ﷺ نے محنت ومشقت سے رزق حلال کھانے والوں کو اللہ کا دوست قرار دیا اور آجر کو اجرت دینے میں جلدی کی تاکید فرمائی ہے کہ: ''مزدور کی اجرت ادا کردو، اس سے پہلے کہ اس کی پیشانی کا پسینہ خشک ہو''۔

رشوت اور حرام خوری کی مذمت:

رشوت ایسا معاوضہ ہے جو کسی بھی عہدہ، منصب، سہولت یا مراعات کے حصول کے لیے صاحبِ اقتدار کو بطور تحفہ یا کسی بھی صورت میں دیا جائے، جس سے کسی دوسرے فرد یا معاشرہ کا حق غصب ہو، اسلام نے رشوت اور حرام خوری کی شدید مذمت کی ہے۔ رسول آخرین حضرت محمد ﷺ نے فرمایا: ''الراشی والمرتشی کلاھما فی النار ''۔ یعنی ''رشوت لینے اور دینے والا دونوں دوزخی ہیں''۔

ملاوٹ:

کسی بھی خالص چیز میں کسی ناقص چیز کی ملاوٹ سے اسلام نے سختی سے منع فرمایا ہے، مثلاً: دودھ میں پانی یا پاؤڈر کی ملاوٹ، گندم اور اناج میں کسی دوسری سستی جنس کی ملاوٹ، آٹا، دالیں اور دیگر اشیائے خوردونوش میں ملاوٹ، وغیرہ بہت بڑا جرم ہے، جو افرادِ معاشرہ کی صحت کے لیے انتہائی مضرت رساں ہے اور انسانی جانوں سے کھیلنے کے مترادف ہے۔

ذخیرہ اندوزی:

اشیائے خوردونوش کی ذخیرہ اندوزی اور کمیابی اور مصنوعی قلت پیدا کرنے کی غرض سے اس کی فروخت کو روکے رکھنے اور پھر زیادہ نرخ پر بیچنے کو ممنوع قرار دیا ہے۔ حصولِ رزقِ حلال کے لیے جو اصول وضوابط رسول اللہ ﷺ نے دیئے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی ایسے کام کی اجرت طلب کرنا ناجائز ہے جو بجائے خود حرام ہے، مثلاً: بت بنانا یا شراب بنانا۔ کسی صورت میں شراب یا کتے کی قیمت کا مطالبہ نہیں ہوسکتا، اسی طرح سود کا مطالبہ، جوا، قمار بازی اور سٹہ کو حرام قرار دیا ہے۔

رسول آخرین ﷺ نے فرمایا: ''خرید وفروخت کے وقت تم زیادہ قسمیں کھانے سے بچو، کیونکہ وہ اسے رواج دیتی ہے، مگر پھر برکت کھو دیتی ہے''۔ (مسلم، ابوقتادہؓ)

متانت جاتی رہتی ہے دیانت جاتی رہتی ہے
بظاہر فائدہ ہو بھی شرافت جاتی رہتی ہے
کہا آقاؐ نے جب تم مال بیچو خریدو تم
زیادہ کھاؤ مت قسمیں کہ برکت جاتی رہتی ہے

(اعجاز رحمانی)

دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ''وہ شخص تنگ دلی سے پاک ہوگیا جس نے زکوٰۃ دی اور مہمان نوازی کی اور مصیبت میں صدقہ دیا''۔ (جوامع الکلم)

ہمارے معاشرے میں رشوت، ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی، شراب نوشی اور جوا، وغیرہ جیسے جرائم بکثرت پائے جاتے ہیں جو معاشی، معاشرتی اور اقتصادی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ کا باعث ہیں۔ ان جرائم کے موثر سدباب کے لیے آخر ٹھوس اقدامات کیوں نہیں کیے جاتے؟

انتہائی صدمے کی بات ہے کہ ہمارے معاشرے میں غریب اور مزدور طبقہ کا بری طرح استیصال کیا جاتا ہے، مثلاً رہائش اور مکانات کی تعمیر کے شعبے میں کام کرنے والے ان مزدوروں اور محنت کشوں کے حقوق غصب کیے جاتے ہیں جو اپنے آبائی قصبات سے ہزاروں کلومیٹر دور حصول

رزق حلال کے لیے محنت ومشقت کرتے ہیں اور مزدوروں کا حق ان تک ایجنٹس حضرات پہنچنے ہی نہیں دیتے ہیں یا فلاحی کمیٹیوں کے نام پر چندہ بٹورنے والے حضرات مزدوروں سے چھین لیتے ہیں۔ ایک ایسا شخص جو دن رات، گرمی سردی، دکھ تکلیف، مصائب وآلام برداشت کرتے ہوئے دن بھر مزدوری کرتا ہے اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنے کے لیے جمع کرتا ہے، جب بینک یا گھر سے لاکر صرف وخرچ کے لیے نکلتا ہے تو چنڈا کو اس سے رقم چھین لیتے ہیں۔

انتہائی بدقسمتی کی بات ہے کہ رزق حلال کمانے والے کے ساتھ اس طرح کا ظلم اور زیادتی ہو اور ہمارے اصحاب اقتدار سب اچھا ہے کے گن گاتے رہیں۔ آخر اس انتہائی ظلم کا ذمہ دار کون ہے؟ کوئی ایک فرد، معاشرہ یا اصحاب اقتدار؟ ان میں سے کوئی بھی ذمہ دار ہو، مگر اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ یہ محنت کشوں، مزدوروں اور رزق حلال کمانے والوں کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے!!

دینی اخلاقی، معاشی، معاشرتی اور اقتصادی لحاظ سے نسل نو کی تعمیر اخلاق اور ترقی میں رزق حلال کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ حرام رزق سے دریغ نہ کرنے والے والدین کی اولاد کے رگ وریشہ میں حرام سرایت کرجاتا ہے تو وہ اولاد بھلا دینی، ملکی، اخلاقی، معاشی اور معاشرتی لحاظ سے تعمیر وترقی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے سکتی ہے؟

روح کی بالیدگی رزق حلال کی مرہون منت ہے۔ رزق حلال کے استعمال ہی سے اخلاق حسنہ پروان چڑھتے ہیں۔ جہاں اللہ رب العزت نے انسانی جسم وجاں کی بالیدگی اور نشو ونما کے لیے بے شمار رزق حلال پیدا فرمایا ہے، وہاں روح کی بالیدگی کا بہترین انتظام فرمایا ہے۔ روح کی ترقی انسانیت کی تعمیر وترقی کا دارومدار ہے، اس لیے ''الرزاق جل جلالہٗ'' آسمانی تعلیمات کو بذریعہ انبیاء علیہم السلام وقتاً فوقتاً پہنچاتا رہا ہے، تاآنکہ رسول آخرین حضرت محمد ﷺ پر سلسلہ ختم فرمایا اور دین اسلام مکمل ہوگیا۔ اب ساری انسانیت کی تعمیر وترقی، دارین کی کامیابی وکامرانی آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین پر عمل پیرا ہونے میں مضمر ہے۔

رزق حلال کی تلاش کے بارے میں رسول آخرین ﷺ نے فرمایا: ''اے لوگو! جو چیزیں جنت سے قریب اور دوزخ سے دور کرنے والی ہیں، وہ میں تمہیں بتاچکا ہوں اور ان چیزوں کی بھی نشاندہی کرچکا ہوں جو جنت سے دور اور دوزخ سے قریب کرنے والی ہیں، جبرائیل علیہ السلام نے مجھے خبر دی ہے کہ کوئی انسان اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک وہ اپنے حصے کا مقررہ رزق نہ کھالے''۔ تو اے لوگو! اللہ سے ڈرو اور تلاش رزق میں غلط ذرائع استعمال نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ رزق کی تاخیر سے تم گناہ میں مبتلا ہوجاؤ۔ یاد رکھو! خدا کے ہاں کی چیزیں اس کی اطاعت وفرمانبرداری ہی سے حاصل ہوتی ہیں، بقول علامہ اقبال مرحوم:

پرواز ہے دونوں کی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

کرگس ہمیشہ مردار کھانے کا عادی ہے، مرے ہوئے مردار جانور کی بدبو بیسیوں کلومیٹر دور سے سونگھ کر رزق حرام کھانے کے لیے گروہ در گروہ پہنچ جاتا ہے۔ لیکن اللہ رب العزت نے شاہین کی فطرت میں یہ رکھا ہے کہ وہ شکار زندہ کے بغیر کھاتا ہی نہیں ہے۔ جو افراد معاشرہ رزق حرام کھانے کے عادی ہیں یا عادی کردیئے گئے ہیں وہ ''**الرزاق جل جلالہٗ**'' کی بارگاہ عالی میں خلوص نیت کے ساتھ توبہ واستغفار کریں اور اس کے ساتھ ساتھ ہم سب ''**الرزاق جل جلالہٗ** '' سے رزق حلال کی فراہمی کے آسانی کی دعا مانگیں۔ ''**الرزاق جل جلالہٗ** '' ہمیں، ہماری اولادوں، عزیز واقارب اور تمام مسلمانوں کو رزق حلال عطا فرمائیں، آمین یا **رب العالمین**!۔

کچھ تذکرہ عید اور اعمالِ عید کا

مفتی محمد راشد ڈسکوی

رمضان المبارک کی ابتدا ہو چکی ہے، یقیناً اس بابرکت مہینہ کی رحمتوں، برکتوں اور مغفرتوں سے ہر ہر مسلمان اپنے اپنے ظرف کے مطابق حصہ لے رہا ہوگا۔ ایسے میں چند ایسی گزارشات قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کا خیال پیدا ہوا جن کا تذکرہ اسی ماہِ مبارک میں کیا جانا ضروری تھا، اگرچہ ان کا تعلق اس ماہِ مبارک سے نہیں، بلکہ آنے والے مہینے ''شوّال'' سے ہے، لیکن اس مضمون کا آئندہ شمارہ میں آنا سودمند نہیں تھا، اس لیے کہ جب تک شوال کا شمارہ منظر عام پر آئے گا، اس وقت تک بہت سے ایسے اعمال کا وقت گزر چکا ہوگا جو ذیل میں ذکر کیے جا رہے ہیں، چنانچہ اس مضمون میں ''چاندرات، عید الفطر کے مسنون اعمال، نمازِ عید کا طریقہ اور اگر کوئی شخص عید کی نماز میں مسبوق ہو تو وہ اپنی نمازِ عید کی رہ جانے والی رکعتوں کو کیسے پورا کرے گا؟'' ان اُمور کو بیان کرنا ہے۔ اللہ رب العزت حق بات کو احسن انداز میں پیش کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

چاندرات

احادیثِ مبارکہ میں اس رات کو ''**لیلۃ الجائزۃ** '' (انعام کی رات) کا نام دیا گیا ہے، چوں کہ اس رات میں حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے اپنے بندوں کو انعام دیا جاتا ہے، اس لیے اس رات کا خاص طور پر خیال رکھنا ضروری ہے۔ پورا مہینہ اللہ کے بندے اللہ کو راضی کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں، ایک عجیب تبدیلی کا احساس ہر بندہ محسوس کرتا ہے، عبادات میں ترقی ہو جاتی ہے۔ نماز، تلاوت کلامِ پاک، ذکر واذکار، رب عزوجل سے مناجات، الغرض ہر ہر بندہ اپنے رب کی بندگی میں آگے سے آگے بڑھنے کی تگ ودو میں لگا ہوتا ہے، یہ تو عام لوگوں کا حال ہوتا ہے، خواص کا تو پوچھنا ہی کیا؟! ان کے ہاں تو رمضان المبارک کا مہینہ ایک الگ ہی منظر پیش کر رہا ہوتا ہے، دنیاوی معاملات و مصروفیات کو تو گویا بالکلیہ ہی خیر باد کہہ دیا جاتا ہے، اور دن، رات رب عزوجل کے تعلق وخوشنودی کے حصول کے لیے کوششوں میں گزر جاتی ہے۔

ایسے میں جب یہ مہینہ اپنے اختتام کو پہنچتا ہے تو پھر پہلی رات سے ہی پورے ماہ کی محنت کے بدلے ملنے والے انعامات کا اعلان شروع ہو جاتا ہے۔ مذکورہ تفصیل کے بعد جب اپنے اوپر اور اردگرد کے ماحول پر نظر ڈالتے ہیں تو پھر عام لوگ تو درکنار کچھ خواص قسم کے افراد بھی رمضان کے تھکے ہارے اس رات بے فکر میٹھی نیند سوتے نظر پڑتے ہیں، حالاں کہ یہ رات بھی بہت زیادہ خصوصیت کی حامل ہے۔

عیدین کی راتوں کی فضیلت کے بارے میں وارد ہونے والی کئی روایات سند کے اعتبار سے اگرچہ کچھ کمزور ہیں، لیکن ایک تو فضائل کے معاملہ میں ضعیف روایات قابلِ قبول ہوتی ہیں (بشرطیکہ ضعف شدید نہ ہو) دوسرے ان روایات کے مختلف سندوں کے ساتھ مروی ہونے کی وجہ سے ضعف کسی درجہ میں دور بھی ہو جاتا ہے، لہٰذا اس موقع پر روایات کی سندوں کے ضعف کو بنیاد بنا کر عیدین کی راتوں کی فضیلت کا یکسر انکار کر دینا جمہور کے مؤقف کے خلاف ہے، جیسا کہ صحیح مسلم کے شارح امام نوویؒ نے شرح مسلم میں اور بعض دیگر محدثین نے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔

چنانچہ امام نووی رحمہ اللہ ''شرح مسلم'' میں لکھتے ہیں:

''اتفقوا على استحباب إحياء ليلتي العيدين وغير ذلك''.

(شرح النووی علی صحیح مسلم، کتاب الاعتکاف، باب الاجتهاد فی العشر الأ واخر من شهر رمضان: ۱/۲/۳۷، قدیمی)

ترجمہ:...... ''عیدین کی راتوں میں جاگ کر عبادت کرنے کے استحباب پر جمہور علماء نے اتفاق کیا ہے''۔

چنانچہ بہت سی کتبِ احادیث میں مثلاً: ابن ماجہ، الترغیب والترہیب، شعب الإیمان للبیہقی، الجامع الصغیر، کنز العمال، مصنف عبدالرزاق، سنن الکبریٰ للبیہقی وغیرہ میں مذکور ہے:

''من قام ليلتي العيدين محتسباً لم يمت قلبه يوم تموت القلوب''.

(سنن الکبریٰ للبیہقی، باب عبادة لیلة العیدین، رقم الحدیث: ۶۵۱۸، ۳/۳۱۹، مجلس دائرة المعارف)

ترجمہ:...... ''جس شخص نے عیدین (عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ) کی راتوں کو ثواب کی اُمید رکھتے ہوئے زندہ رکھا (عبادت میں مشغول اور گناہ سے بچا رہا) تو اس کا دل اس (قیامت کے ہولناک اور دہشت ناک) دن نہ مرے گا، جس دن لوگوں کے دل (خوف وہراس اور دہشت وگھبراہٹ کی وجہ سے) مردہ ہو جائیں گے''۔

اتنی بڑی فضیلت اور اس سے ہماری غفلت!! ڈر ہے کہ کہیں ہماری اس ناشکری کا وبال ہمیں اس منعم کے عتاب میں ہی نہ مبتلا کر دے۔

عیدالفطر

عیدالفطر مسلمانوں کے لیے بہت زیادہ خوشی کا دن ہے، اس خوشی کی وجہ یہ ہے کہ اس دن مسلمان اللہ جل شانہ کی توفیق اور اس کے فضل وکرم سے اپنے ذمہ عائد ایک بہت بڑے فریضے کی تکمیل کر

چکے ہوتے ہیں۔ پورا مہینہ دن کو روزہ اور شب میں تراویح کی ادائیگی اور اس میں کلامِ الٰہی کے پڑھنے اوراس کے سننے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔اس محنت کا بدلہ یا مزدوری اس عیدالفطر کے دن دیا جاتا ہے، اسی لیے اس دن کو آسمانوں میں ''یوم الجائزۃ ''(انعام کا دن)اوراس کی رات کو''لیلۃ الجائزۃ '' (انعام کی رات) کہہ کر پکارا جاتا ہے، جیسا کہ آگے حدیث شریف میں آرہا ہے۔الغرض عید کے دن اور اس کی رات کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بڑی فضیلت اور اہمیت ہے۔

امام بیہقی رحمہ اللہ نے''شعب الایمان'' میں ایک لمبی حدیث نقل کی ہے، جس کے کچھ حصے کا ترجمہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے، جس سے اس دن اور رات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے بندوں کے ساتھ ہونے والے معاملے کا اندازہ ہوسکتا ہے:

''پھر جب عیدالفطر کی رات ہوتی ہے تو (آسمانوں میں) اس کا نام ''**لیلۃ الجائزۃ**''(انعام کی رات) سے لیا جاتا ہے۔ اور جب عید کی صبح ہوتی ہے تو اللہ رب العزت فرشتوں کو تمام شہروں کی طرف بھیجتے ہیں، وہ زمین پر اتر کر تمام گلیوں (راستوں) کے سروں پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایسی آواز سے جس کو جن وانس کے سوا ہر مخلوق سنتی ہے، پُکارتے ہیں کہ اے امتِ محمدیہ! (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) اُس ربِ کریم کی (بارگاہ کی) طرف چلو جو بہت زیادہ عطا کرنے والا ہے، اور بڑے سے بڑے قصور کو معاف فرمانے والا ہے۔ پھر جب لوگ عیدگاہ کی طرف نکلتے ہیں تو حق تعالیٰ شانہ فرشتوں سے دریافت فرماتے ہیں: کیا بدلہ ہے اُس مزدور کا جو اپنا کام پورا کر چکا ہو؟ وہ عرض کرتے ہیں کہ: اے ہمارے معبود اور مالک! اس کا بدلہ یہی ہے کہ اس کو اس کی مزدوری پوری پوری ادا کر دی جائے، تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ''**فإني أشھدکم یا ملائکتي! إني قد جعلتُ ثوابھم من صیامھم شھر رمضان وقیامھم رضائي ومغفرتي** ''...... یعنی''فرشتو! میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے ان کو رمضان کے روزوں اور تراویح کے بدلہ میں اپنی رضا اور مغفرت عطا کر دی''۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے خطاب فرما کر ارشاد فرماتے ہیں:

''اے میرے بندو! مجھ سے مانگو، میری عزت کی قسم! میرے جلال کی قسم! آج کے دن اپنے اس اجتماع میں مجھ سے اپنی آخرت کے بارے میں جو سوال کرو گے عطا کروں گا، اور دنیا کے بارے میں جو سوال کرو گے اس میں تمہاری مصلحت پر غور کروں گا۔ میری عزت کی قسم! جب تک تم میرا خیال رکھو گے میں تمہاری لغزشوں کی ستاری کرتا رہوں گا (اور ان کو چُھپاتا رہوں گا) میری عزت کی قسم! میرے جلال کی قسم! میں تمہیں مجرموں (اور کافروں) کے سامنے رُسوا نہیں کروں گا۔ بس! اب بخشے بخشائے اپنے گھروں کی طرف لوٹ جاؤ، تم نے مجھے راضی کر دیا اور میں تم سے راضی ہوگیا۔ پس فرشتے اس اجر وثواب کو دیکھ کر جو اس امت کو افطار کے دن ملتا ہے، خوشیاں مناتے ہیں اور کِھل جاتے ہیں''۔ (**اللّٰھم اجعلنا منھم، آمین**)

لہٰذا! اللہ رب العزت کی (عطایا کی) طرف دیکھتے ہوئے ہمیں بھی چاہئے کہ اس دن کو بھی اور اس بعد کے ایام کو بھی اس کی منشاً کے مطابق گزارنے کی کوشش کریں کہ یہی اس کی عطایا کی قدردانی ہے، چنانچہ ذیل میں عیدالفطر کے دن کے مسنون اور مستحب اعمال تحریر کیے جاتے ہیں:

عید کے دن کے اعمال

۱:......عید کے دن صبح سویرے اٹھنا۔ ''ویستحب .....التبکیر وھو سرعة الانتباہ''.

(العالمگیریۃ: ۱/۱۴۹، رشیدیۃ)

۲:......نمازِ فجر اپنے محلے کی مسجد میں پڑھنا۔ ''ومن المندوبات صلاۃ الصبح فی مسجد حیہ''۔ (ردالمحتار: ۳/۵۶، دارالمعرفۃ)

۳:......جسم کے زائد بال اور ناخن وغیرہ کاٹنا۔ ''ویتطیب بإزالۃ الشعر وقلم الأظفار''۔

(حلبی کبیر، ص: ۵۶۶، سہیل اکیڈمی)

۴:......غسل کرنا۔

۵:......مسواک کرنا۔ (یہ اس مسواک کرنے کے علاوہ ہے جو وضو میں کی جاتی ہے، نیز مسواک کرنا خواتین کے لیے بھی مسنون ہے)

۶:...... جو کپڑے پاس ہوں اُن میں سے اچھے عمدہ کپڑے پہننا۔ نئے ہوں تو نئے پہن لیے جائیں، ورنہ دُھلے ہوئے پہنے جائیں۔

۷:......خوشبو لگانا (لیکن خواتین تیز خوشبو نہ لگائیں)۔ ''ثم یستحب لصلاۃ العید ما یستحب لصلاۃ الجمعۃ مِنَ الِاغتسال والاِستیاک والتطیُّب ولُبس أحسنِ الثیابِ والتبکیرِ إلی المُصلّٰی لأنہ یوم اجتماع للعبادۃ کالجُمعۃ فیستحبُ التَنظِیف وإظھارالنِعُمۃ والمُسَارعۃ''۔ (حلبی کبیر، ص: ۵۶۶، سہیل اکیڈمی)

۸:......انگوٹھی پہننا۔ (مردوں کے لیے زیادہ سے زیادہ ساڑھے چار ماشہ چاندی کی انگوٹھی پہننا جائز ہے، اس سے زیادہ یا کسی اور دھات کی انگوٹھی پہننا جائز نہیں) (ردالمحتار: ۳/۵۶، دارالمعرفۃ)

۹:......اگر صدقۂ فطر ابھی تک ادا نہ کیا ہو تو عید کی نماز سے پہلے پہلے ادا کرنا۔ ''ویؤدّی صدقۃ الفطر إغناءً لِلفقیرِ لِیَتَفَرَّغ قلبُہ للصلاۃ''۔ (فتح القدیر: ۲/۷۰، دارالکتب العلمیۃ)

۱۰:......عیدگاہ کی طرف جلدی جانا۔ ''ویُستَحَبُّ.....الِابتکارُوھو المُسارعۃ إلیٰ المُصَلّٰی''۔ (العالمگیریۃ: ۱/۱۴۹، رشیدیۃ)

۱۱:...... پیدل چل کر عیدگاہ جانا، البتہ اگر کوئی عذر ہو تو سواری پر جانے میں مضائقہ نہیں۔ ''ثُمّ خُروجُہ ماشیاًإلیٰ الجَبَانۃِ''۔ (ردالمحتار: ۳/۵۶، دارالمعرفۃ)

۱۲:......نمازِ عید، عیدگاہ میں ادا کرنا، البتہ اگر کوئی عذر ہو (مثلاً: بارش ہو، دشمن کا خوف ہو یا عید

گاہ میں امام صحیح العقیدہ نہ ہو) تو مسجدِ محلّہ میں ہی نمازِ عید ادا کر لی جائے۔ (کذافی امداد الاحکام:۱/۷۳۳)

۱۳:......عید گاہ کی طرف جاتے ہوئے آہستہ آواز میں تکبیراتِ تشریق کہتے ہوئے جانا، اور عید گاہ پہنچ کر تکبیرات بند کر دینا، تکبیراتِ تشریق یہ ہیں: ''اَللّٰہُ أَکْبَرُ، اَللّٰہُ أَکْبَرُ، لآإلٰہ إلا اللّٰہُ واللّٰہُ أَکْبَرُ، أَللّٰہُ أَکْبَرُ ولِلّٰہِ الحمدُ''۔

''ویُستَحبُّ التکبیرُ جهراً فی طَریق المُصلّٰی یومَ الأضحیٰ إتّفاقاً للإجماع وأمّا یوم الفطرفقال أبو حنِیفةَ لایُجهَرُ بِہٖ''۔ (حلبی کبیر،ص:۵۶۶، سھیل اکیڈمی)

۱۴:......عید الفطر کی نماز کے لیے جانے سے پہلے کچھ کھالینا، اگر کوئی میٹھی چیز ہو (کھجور، چھوہارے یا کوئی اور چیز) تو طاق عدد میں کھانا بہتر ہے، اور اگر میٹھی چیز نہ ہو تو کوئی بھی چیز کھالی جائے۔ ''ویستحب فی یوم الفطر أنْ یطعم قبل أن یَخْرُجَ إلی المُصَلّٰی''۔ (فتح القدیر:۲/۶۹، دار الکتب العلمیة)

۱۵:......نمازِ عید ادا کرنے کے بعد واپسی پر راستہ بدل کر آنا۔ (مرقاۃ:۳/۲۹۰، رشیدیہ)

۱۶:...... ہر کسی سے خوش اخلاقی سے پیش آنا، بشاشت کا اظہار کرنا اور غیظ وغضب سے پرہیز کرنا۔ ''ونُدِب...... إظهارُ البَشاشَة''۔ (ردالمحتار:۳/۵۶، دار المعرفة)

۱۷:......اپنی وسعت کے مطابق مستحقین اور مساکین کی مدد کرنا۔ ''ونُدِب .... إکثارُ الصَّدَقَةِ''۔ (ردالمحتار:۳/۵۶، دار المعرفة)

۱۸:......اپنی حیثیت کے مطابق اپنے گھر والوں پر کھانے وغیرہ کے اعتبار سے کشادگی کرنا۔

۱۹:......اگر ممکن ہو تو عید کے دن جبہ پہننا۔ ''ویندُب للرّجال وکان للنبی ﷺ جُبّةُ فَنَکٍ یلبَسُها فی الجُمَع والأعیاد''۔ (حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح،ص:۲۸۹، دار الکتب العلمیة)

۲۰:......ایک دوسرے کو مبارک باد دینا (بشرطیکہ اس کو لازم نہ سمجھا جائے)۔ ''وَنُدِبَ ..... التَهنِئَةُ بتقبَّلُ اللّٰہُ مِنَّا ومِنْکُمْ''۔ (ردالمحتار:۳/۵۶، دار المعرفة۔عمدۃ الفقہ:۲/۲۵۹،۲۶۰ ملخصاً)۔

نمازِ عید کا طریقہ

عید کی نماز دو رکعت ہے، اس کا طریقہ عام نمازوں کی ہی طرح ہے، البتہ اس نماز میں چھ تکبیریں زائد ہوتی ہیں (تین پہلی رکعت میں قراءت سے پہلے اور تین دوسری رکعت میں رکوع سے پہلے) یہ تکبیرات واجب ہیں، اور ان کا ثبوت نبی کریم ﷺ، صحابہ کرامؓ اور کئی تابعین کرامؒ سے ہے۔

(مسند احمد، شرح معانی الآثار، مصنف ابن ابی شیبہ، مصنف عبد الرزاق، مبسوط سرخسی، کتاب الآثار، اوجز المسالک وغیرہ)

نماز کا طریقہ یہ ہے: سب سے پہلے دل میں یا زبان سے نیت کر لے کہ ''دو رکعت عید کی واجب نماز، چھ واجب تکبیروں کے ساتھ اس امام کے پیچھے پڑھتا ہوں'' اس کے بعد تکبیر تحریمہ یعنی ''اللّٰہ أکبر'' کہہ کر ہاتھ باندھ لے، پھر ثناء، یعنی: ''سبحٰنک اللّٰهم...الخ'' پڑھ کے تین بار ''اللّٰہ أکبر'' کہے، پہلی اور دوسری بار کانوں تک ہاتھ اُٹھا کر نیچے لٹکا دے، البتہ تیسری بار ہاتھ نہ لٹکائے، بلکہ

باندھ لے، اس کے بعد امام ''أعوذ باللّٰہ'' اور ''بسم اللّٰہ'' پڑھ کے قراءت کرے اور حسبِ قاعدہ پہلی رکعت پوری کرے۔ دوسری رکعت میں قراءت کرنے کے بعد رکوع سے پہلے اسی طرح تین مرتبہ ''اللّٰہ أکبر'' کہے، جیسے پہلی رکعت میں کیا تھا، البتہ یہاں تینوں مرتبہ ہاتھ اُٹھا کر چھوڑ دے اور چوتھی بار رکوع کی تکبیر ''اللّٰہ أکبر'' کہہ کر رکوع میں چلا جائے، اور حسبِ قاعدہ نماز مکمل کرے۔

اگر کچھ رکعتیں چھوٹ جائیں تو نمازِ عید میں ملنے کا طریقہ

فرائض اسلام میں سب سے بڑا، اہم اور ذی شان فریضہ ''نماز'' ہے، لیکن مقامِ افسوس ہے کہ مجموعہ امتِ مسلمہ کا شاید دس فیصد طبقہ ہی اس اہم فریضہ کی طرف متوجہ ہوگا اور اس مختصر مجموعہ میں سے اس مقدس فریضہ کے جملہ مسائل سے واقفیت رکھنے والے بھی گنتی کے ہی افراد ہیں، انہی مسائل نماز میں سے ایک اہم مسئلہ ''نمازوں کی چھوٹی ہوئی رکعات کی ادائیگی کا طریقہ'' ہے۔ نمازی حضرات پانچوں نمازوں میں رہ جانے والی رکعات کو ادا کرنے کا طریقہ تو جانتے ہی ہوں گے، لیکن ''نمازعید'' (جو سال میں دو بار ہی آتی ہے) کی کوئی رکعت، یا تکبیراتِ زوائد رہ جائیں تو ان کی ادائیگی کیسے کی جائے گی؟ اس کی وضاحت تو ائمہ مساجد سے بھی بیان کرتے نہیں سنا گیا، چہ جائے کہ نمازی حضرات ان مسائل سے کما حقہ واقف ہوں، اور اگر کوئی امام صاحب اس مسئلہ کو بیان کرتے سنے بھی گئے تو عید کی نماز سے پہلے بیان کر رہے ہوتے ہیں، حالاں کہ یہ مسئلہ ان افراد سے متعلق ہے جو کسی عذر کی بناء پر تأخیر سے نماز میں شریک ہو رہے ہوں، نہ کہ ان افراد کے لیے جو پہلے سے مسجد یا عیدگاہ میں موجود ہیں۔

لہٰذا سوچا گیا کہ ''نمازعید'' میں مسبوق (یعنی وہ افراد جن کی کوئی رکعت یا تکبیرات رہ گئی ہوں) کی جتنی بھی صورتیں بن سکتی ہوں، ان کو تفصیل سے بیان کر دیا جائے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ علمائے کرام وائمہ مساجد اگر عید المبارک سے چند روز قبل تفصیل سے بیان کر دیں، تا کہ بہت سے صوم وصلوۃ کے پابند حضرات کی نمازِ عید خراب ہونے سے بچ سکے۔

ذیل میں وہ تمام (متوقع) صورتیں جو پیش آسکتی ہیں، ان کا حکم ذکر کیا جاتا ہے:

۱:......اگر کوئی شخص ایسے وقت نماز میں شریک ہوا جب امام تکبیراتِ زوائد کہہ چکا تھا، تو ایسے شخص کے لیے حکم یہ ہے کہ تکبیرِ تحریمہ کہہ کر ہاتھ باندھنے کے بعد فوراً تین تکبیراتِ زوائد کہے اور اس کے بعد خاموشی سے امام کی قراءت سنے۔ (ردالمحتار: ۳/۶۴، دارالمعرفہ، بیروت)

۲:......اگر کوئی شخص ایسے وقت نماز میں شریک ہوا جب امام رکوع میں چلا گیا تھا، تو یہ شخص اندازہ کرے کہ اگر وہ قیام کی حالت میں ہی تکبیرات کہہ کر امام کے ساتھ رکوع میں شامل ہوسکتا ہو، تو ایسا ہی کرے اور اگر اس کا گمان یہ ہو کہ اگر میں نے قیام کی حالت میں تکبیرات کہیں تو امام رکوع سے اٹھ جائے گا، تو اس آنے والے کو چاہئے کہ وہ رکوع میں چلا جائے اور رکوع میں تسبیحات کی بجائے تکبیرات کہے، لیکن اس وقت تکبیرات کہتے ہوئے ہاتھ نہیں اٹھائے جائیں گے، بلکہ ہاتھ گھٹنے پر ہی رکھے رہیں۔

ہاں! اگر رکوع میں تکبیرات کہنے کے بعد وقت ہو تو رکوع کی تسبیحات بھی کہہ لی جائیں، اور اگر آنے والا رکوع میں چلا گیا اور ابھی رکوع کی حالت میں ایک بار تکبیر کہہ پایا تھا، یا زیادہ، یا کچھ بھی نہیں کہہ پایا تھا کہ امام رکوع سے اٹھ گیا تو یہ بھی رکوع سے اٹھ جائے، بقیہ تکبیریں اس سے ساقط ہیں۔ (عالمگیریہ: ۱/۱۵۱، رشیدیہ)

۳:......اگر کوئی ایسے وقت نماز میں شریک ہوا جب امام پہلی رکعت کے رکوع سے اٹھ گیا تھا، یا دوسری رکعت میں قراءت شروع کر چکا تھا، تو اب آنے والا امام کی متابعت کرے، یعنی جس طرح امام کر رہا ہے اسی طرح کرتا رہے۔ پھر امام کے سلام پھیرنے کے بعد رہ جانے والی رکعت اس ترتیب سے ادا کرے گا کہ اول کھڑے ہو کر ثناء پڑھے، پھر سورۃ الفاتحہ پڑھے، پھر سورت ملائے، اور پھر رکوع میں جانے سے پہلے تین تکبیراتِ زوائد کہے، پھر رکوع میں جائے، یعنی صورت کے اعتبار سے ''امام کے ساتھ پڑھی ہوئی دوسری رکعت اور یہ رکعت جو ادا کی جا رہی ہے'' دونوں رکعتیں ایک جیسی ہوں گی، یہ اصح قول ہے۔ (البحر الرائق: ۲/۲۸۲، دار الکتب العلمیہ)

۴:......اگر کوئی شخص دوسری رکعت میں ایسے وقت پہنچا جب امام تکبیرات کہہ کر رکوع میں جا چکا تھا، تو اب پھر پہلی رکعت کی طرح اندازہ کرے کہ تکبیرات کہہ کر امام کو رکوع میں پا سکتا ہے، یا نہیں؟ اگر پا سکتا ہے تو ایسا ہی کرے، اور اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو رکوع میں جا کر تکبیرات کہے، اور اگر امام رکوع سے اٹھ گیا یعنی مقتدی سے دونوں رکعتیں رہ گئیں، تو یہ دونوں رکعتیں اسی طرح پوری کرے، جیسے عام ترتیب میں امام کے پیچھے پڑھی جاتی ہیں۔ (تاتارخانیہ: ۲/۳۷، قدیمی)

۵:......اگر کوئی ایسے وقت میں پہنچا جب امام سلام پھیر چکا تھا، تو اب اکیلا اس نماز عید کو نہیں پڑھ سکتا، اس شخص کو چاہئے کہ کسی ایسی مسجد، یا عید گاہ کو تلاش کرے جہاں ابھی تک عید کی نماز نہ ہوئی ہو، وہاں جا کر نماز ادا کرے اور اگر اس کو کوئی ایسی جگہ نہ ملے تو اس کے لیے مستحب ہے کہ چاشت کے وقت چار رکعت نفل ادا کرے۔ (ردالمحتار: ۳/۶۷، دار المعرفہ)

الغرض! مذکورہ بالا ممکنہ صورتیں ہی کسی کو پیش آ سکتی ہیں، اگر علمائے کرام اور ائمہ مساجد انہیں ''عید'' سے کچھ دن پہلے ہی سے ایک ایک کر کے بیان کر دیا کریں، تو یقیناً بہت سارے مسلمانوں کی ''عیدین'' کی نماز خراب ہونے سے بچ جائے گی۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اپنی مرضیات کے مطابق چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

☆☆☆

آہ! میرے دوست حکیم محمد اخترؒ

جناب نثار احمد خاں فتحی

یہ تقریباً ساٹھ برس پہلے کی بات ہے کہ میرے پڑوس میں حضرت مولانا تھانویؒ کے ایک مرید مولوی عبدالوحید خانؒ رہتے تھے، جو حضرت تھانویؒ کے حلقہ میں بہت مقبول تھے، ان کے ہی ذریعے اس خاکسار نے بہت سے بزرگوں کی زیارت کی اور بہت سوں کی صحبت بھی نصیب ہوئی، جیسے قاری محمد طیبؒ، مفتی محمد شفیعؒ، مولانا فقیر محمدؒ، ڈاکٹر عبدالحیؒ، مولانا ابرار الحقؒ، مولانا عبدالرحمٰن کاملپوریؒ، مفتی محمد حسنؒ، حضرت قاری فتح محمدؒ اور دوسرے بہت سے بزرگ۔ انہیں میں حضرت عبدالغنی پھولپوریؒ بھی تھے۔

حضرت پھولپوریؒ کی مجلس میں اکثر جانا ہوتا تھا، ایک نوجوان کتاب پڑھتے تھے، درمیان میں ان پر گریہ بھی طاری ہوتا، بعد میں معلوم ہوا کہ ان کا نام حکیم محمد اختر ہے اور یہ حضرت پھولپوریؒ کی دوسری بیوی کے بیٹے ہیں۔ حضرت پھولپوریؒ کے انتقال کے بعد حکیم محمد اختر اپنے طبی مشغلے کی طرف مشغول ہو گئے، اس وقت تک ان سے کوئی بیعت نہیں ہوا تھا۔ یہی زمانہ تھا جب یہ خاکسار عبدالوحید خانؒ کے ساتھ حکیم محمد اختر کے یہاں جایا کرتا تھا، کئی کئی گھنٹوں پر محیط بڑی پُرلطف نشست ہوا کرتی تھی، مختلف موضوع پر گفتگو ہوتی، درمیان میں شعر وشاعری کا سلسلہ بھی چلتا تھا۔ میرے اشعار بہت پسند کرتے تھے، خاص طور پر یہ میرے تین اشعار ابتدا میں ان کے وعظ کی جان ہوا کرتے تھے:

لوٹ آئے جتنے فرزانے گئے
تابہ منزل صرف دیوانے گئے
مستند رشتے وہی مانے گئے
جن سے ہوکر تیرے دیوانے گئے
آہ کو نسبت ہے کچھ عشاق سے
آہ نکلی اور پہچانے گئے

چنانچہ میری کتاب ''حسرتِ نایافت'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نثار صاحب میرے قدیم دوستوں میں سے ہیں، ان کے کلام سے احقر ذاتی

طور پر بہت متأثر ہے اور اپنے مواعظ میں ان کے یہ تین اشعار اکثر پیش کرتا رہتا ہے، جو آفاق عالم میں غلغلہ مچاتے رہتے ہیں''۔

حق تعالیٰ کے یہاں ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے۔ اس کے علاوہ حق تعالیٰ جس سے جو کام لینا چاہتے ہیں، اس کے لوازمات اور معاون اسباب بھی غیب سے عطا کر دیئے جاتے ہیں۔ جس طرح کوہِ آتش فشاں میں گرم لاوا ابلتا اور پکتا رہتا ہے، پھر ایک وقت آتا ہے کہ وہ پھٹ کر باہر نکلتا ہے اور دور دور تک اپنی آتش فشانی کے جوہر دکھاتا ہے، بالکل اسی طرح حکیم محمد اختر ؒ کے دل میں بھی خدا کی محبت، اس کی فرمانبرداری اور اتباع سنت اور دعوت الی اللہ کا کوہ آتش فشاں دہک رہا تھا، جو وقت آنے پر ایسا پھٹا کہ ہزاروں لوگوں کے پتھر دلوں کو نرم کر گیا، ہزاروں پیاسی زبانوں کو خدا کی محبت کی چاشنی دے گیا، ہزاروں حسن فانی کے پرستاروں کو حسن حقیقی کا عاشق بنا گیا۔ وہ جس خزاں رسیدہ جگہ گیا، اس کو رشک بہار بنا گیا۔ ہندوستان، پاکستان، افریقہ، پیرس، ری یونین، بنگلہ دیش، وہ جس جگہ بھی گیا، اس نے اپنی شعلہ بیانی سے ہر سامع کے دل میں محبت الٰہی کا شعلہ رکھ دیا، اس نے ہر بوالہوس کی آنکھیں نیچی کر دیں، تاکہ آبروئے شیوۂ اہل نظر برقرار رہے۔

حکیم محمد اختر ؒ کی تقریر کا انداز مختلف اور بڑا عجیب تھا۔ دن میں دو دو، تین تین مرتبہ تقریر اور ہر تقریر خود شہادت دیتی کہ ''آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں'' پھر دوران تقریر علامہ آلوسیؒ کی تفسیر ''روح المعانی'' اور ملا علی قاریؒ کی ''مرقاۃ'' کے برجستہ حوالے، مضمون کی مناسبت سے اردو اور فارسی کے اشعار، بزرگان دین کے واقعات، اپنے مشائخ واکابرین کے حالات اور ملفوظات، یہ ساری چیزیں ملا کر ان کی تقریر کو اس قدر دلچسپ بنا دیتی تھیں کہ سامعین ''وہ کہیں اور سنا کرے کوئی'' کا مصداق بن جاتے تھے۔ میری چونکہ بے تکلفی تھی، اس لیے ایک دن میں نے کہا: حکیم صاحب! آپ کے شیخ مولانا ابرار الحق صاحب بھی یہاں تقریر کرتے ہیں، مگر آپ کی تقریر میں جو لطف آتا ہے وہ ان کی تقریر میں نہیں آتا۔ کہنے لگے: میرے شیخ اسٹرکچر (Structure) تیار کرتے ہیں، میں اس پر ڈسٹیمپر (Distember) کرتا ہوں۔ حکیم محمد اختر ؒ میں حس مزاح بھی بہت اعلیٰ درجہ کی تھی، جو انسان کے زندہ دل ہونے کی نشانی ہے۔ مجھے اکثر خانقاہ میں دیکھ کر مسکراتے اور کہتے ''جان تم پر نثار کرتا ہوں''، میں جواب میں کہتا ''اس کا میں اعتبار کرتا ہوں''، بہت خوشی کا اظہار کرتے۔

حکیم محمد اختر ؒ کے تمام مواعظ، مکتوبات اور تقاریر کا مرکزی خیال کیا تھا؟ میر عشرت جمیل صاحب ''فیضان محبت'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''حضرت والا کا کلام نہ گل وبلبل کے قصے ہیں، نہ شراب معشوقان فانی کی لچر داستانیں، بلکہ حسن فانی وعشق مجازی اور بدنظری کے خلاف اعلان جہاد ہے۔ اس روحانی کینسر کے علاج کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت والا کو خاص توفیق بخشی ہے۔ اکابر علماء بھی اس بات کے معترف ہیں کہ اس موضوع خاص میں حضرت والا موید من اللہ ہیں''۔

میر صاحب نے جو کچھ لکھا، وہ سو فیصد درست ہے اور اس کے گواہ حکیم محمد اختر صاحب کے وہ سینکڑوں مواعظ ہیں، جو اَب کتابی شکل میں موجود ہیں اور کئی زبانوں میں ترجمہ کیے گئے ہیں، جن سے ایک دنیا فیض اٹھا رہی ہے اور یہ بہترین ترکہ اور صدقۂ جاریہ ہے، جو حکیم محمد اخترؒ چھوڑ کر گئے ہیں۔

حکیم محمد اخترؒ کے انتقال کی خبر مجھے رات کے دس بجے کے قریب موصول ہوئی، فوراً خانقاہ کا رخ کیا، اس امید پر کہ شاید مجھے غسل وغیرہ میں شرکت کی سعادت نصیب ہو جائے، مگر وہاں جا کر دیکھا تو غسل شدہ کفن پوش میت ایک کمرہ میں رکھی ہوئی ہے، جس کے چاروں طرف شیشے لگے ہوئے تھے اور باہر سے لوگ چہرہ کی زیارت کر رہے تھے۔ میں نے بہت سے بزرگوں کے چہرہ کی دفن سے قبل زیارت کی ہے، مگر میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ ایسا پُر نور، پُرسکون اور شاداب چہرہ میں نے کسی کا نہیں دیکھا۔ مجھ اندھے کو معلوم نہ تھا کہ انوار کسے کہتے ہیں، حکیم محمد اخترؒ کا چہرہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اب دیکھ لو، اتباعِ سنت کے انوار کیسے ہوئے ہیں!۔ حکیم محمد اخترؒ کے چہرے کی زیارت سے میرے قلب پر ایک خاص روحانی اثر ہوا ہے، جو اَب تک قائم ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ سب نے ایسا ہی دیکھا یا خاص طور پر مجھے دکھایا گیا ہے اور ایک دیرینہ دوست نے اپنی دوستی کا حق ادا کیا ہے۔

دوسرے دن نمازِ جنازہ کے لیے روانہ ہوا، لیکن انتہائی کوشش کے باوجود نماز میں شرکت نہ کر سکا، خانقاہ کے باہر ہزار ہا لوگوں کا ہجوم جمع تھا، ٹریفک جام ہو گیا تھا اور ایک کو دوسرے کی خبر نہیں تھی۔ خواجہ خان محمدؒ کے جنازے کے بعد غالباً یہ دوسرا جنازہ تھا، جس میں اس قدر کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔

آج سے تقریباً بیس، پچیس برس پہلے میں نے کچھ اشعار حکیم محمد اختر صاحبؒ کے متعلق کہے تھے، جس میں میرے حسن ظن کو زیادہ دخل تھا، مقطع میں دعا بھی کی تھی کہ الٰہی! میرے اس حسن ظن کو حقیقت میں بدل دے، بعد کے حالات گواہی دیتے ہیں کہ دعا قبول ہوگئی، وہ اشعار یہ ہیں:

اسم ہادی کا نام مظہر ہے
ہم میں ایسا بھی اک قلندر ہے

بیش و کم کے غموں سے فارغ ہے
گھر میں رہتے ہوئے بھی بے گھر ہے

چہرہ تقویٰ کے نور سے روشن
شمع ایماں سے دل منور ہے

جس کو حاصل ہے نسبتِ امداد
نسبتوں میں جو اِک سمندر ہے

باتیں کرتا ہے جذب و مستی کی
سوختہ جاں ہے دل بھی مضطر ہے

عشق کے سوز و ساز کی اس کو
سب کتاب و حدیث ازبر ہے
ہر نشست اس کی راحت جاں ہے
ہر بیاں اس کا روح پرور ہے
کام اس کا رفوگری دل کی
نام اس کا حکیم اختر ہے
حسن ظن کو نثار کے یا رب!
سچا کردے تو بندہ پرور ہے

حق تعالیٰ حکیم محمد اختر ؒ کو ان کی خدماتِ دین کے صلے میں ہماری اور تمام معتقدین کی طرف سے بہترین جزائے خیر اور جنت میں اعلیٰ درجات عطا فرمائے۔ حکیم محمد مظہر صاحب اور میر عشرت جمیل صاحب کے غم میں یہ خاکسار برابر کا شریک ہے، مگر تاب لائے ہی بنے گی غالب! واقعہ سخت ہے اور جان عزیز۔

آج رخصت جہاں سے داغ ہوا
خانۂ عشق بے چراغ ہوا

چاندی اور دیگر دھاتوں کی انگوٹھی پہننے کا حکم

ادارہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین وشرع مبین درج ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ:

ا:.....مردوں کے لیے چاندی کے علاوہ پیتل، اسٹیل، لوہا یا کسی بھی طرح کی اور دھات کی انگوٹھی پہننا کیسا ہے؟

۲:.....عورتیں' سونا، چاندی کے علاوہ کسی بھی دھات کا مصنوعی زیور پہن سکتی ہیں؟ اور مصنوعی زیور پہن کر نماز پڑھنے کا شرعی حکم کیسا ہے؟

۳:.....مردوں کے لیے چاندی کی انگوٹھی کتنی مقدار کی پہننا درست ہے؟ کونسے ہاتھ اور کونسی انگلی میں پہننا چاہیئے؟ اور اُسے پہننا شرعاً کیا ہے؟

مستفتی: شیخ صلاح الدین، فیڈرل بی ایریا، کراچی

الجواب باسمہٖ تعالیٰ

ا:.....واضح رہے کہ مردوں کے لیے چاندی کے علاوہ پیتل، لوہا، اسٹیل یا کسی بھی طرح کی دھات کی بنی ہوئی انگوٹھی پہننا جائز نہیں ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

''وعن بریدة أن النبی ﷺ قال لرجل علیه خاتم من شبه: مالی أجد منک ریح الأصنام؟ فطرحه، ثم جاء وعلیه خاتم من حدید، فقال: مالی أریٰ علیک حلیة أهل النار؟ فطرحه، فقال: یا رسول الله! من أی شیئ أتخذه؟ قال: من ورق، ولا تتمه مثقالاً''۔ (مشکاۃ المصابیح، کتاب اللباس، باب الخاتم، ۲/۳۷۸، ط: قدیمی)

ترجمہ:.....''حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ نے ایک شخص سے جو پیتل کی انگوٹھی پہنے ہوئے تھا، فرمایا کہ: مجھے کیا ہوا ہے کہ میں تم میں بتوں کی بُو پاتا ہوں؟ چنانچہ اس شخص نے آنحضرت ﷺ کی یہ ناگواری دیکھ کر اس انگوٹھی کو

اتار پھینک دیا، پھر (جب دوبارہ) وہ شخص آیا تو لوہے کی انگوٹھی پہنے ہوئے تھا، آنحضرت ﷺ نے (اس کو دیکھ کر) فرمایا کہ: مجھے کیا ہوا ہے کہ میں تم پر دوزخیوں کا زیور دیکھ رہا ہوں؟ چنانچہ اس شخص نے اس انگوٹھی کو (بھی) اتار پھینک دیا اور عرض کیا کہ: یارسول اللہ! پھر میں کس چیز کی انگوٹھی بناؤں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: چاندی کی اور وہ چاندی کی بھی پوری مثقال کی نہ ہو‘‘۔ (مظاہر حق جدید،۴/۱۸۷-۱۸۶، ط: دارالاشاعت)

فتاویٰ شامی میں ہے:

’’ولایتختم بغیرها کحجر وذهب وحدید وصفر ورصاص وزجاج وغیرها‘‘۔

وفی ردالمحتار:’’......فعلم أن التختم بالذهب والحدید والصفر حرام، وفی الجوهرة: والتختم بالحدید والصفر والنحاس والرصاص مکروه للرجال والنساء‘‘۔ (ردالمحتار، کتاب الحظر والإباحة، فصل فی اللبس، ۶/۳۶۰-۳۵۹، ط: سعید)

۲:.....عورتوں کے لیے سونا، چاندی کے علاوہ کسی اور دھات کے زیورات پہننا جائز ہے، چاہے انہیں سونا یا چاندی کا پانی دیا گیا ہو یا نہیں، ہر حالت میں پہن سکتی ہیں۔لہٰذا مصنوعی زیور پہن کر نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ انگوٹھی صرف سونا، چاندی کی پہن سکتی ہیں۔فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

’’ولابأس بأن یتخذ خاتم حدید قد لوی علیه فضة أو ألبس بفضة حتی لایریٰ، کذا فی المحیط‘‘۔(الفتاویٰ الهندیة، کتاب الکراهیة، الباب العاشر،۵/۳۳۵، ط: رشیدیہ)

’’ولابأس للنساء بتعلیق الحرز فی شعورهن من صفر أو نحاس أو شبه أو حدید ونحوها للزینة والسوار منها‘‘۔(الفتاویٰ الهندیة، کتاب الکراهیة، الباب العشرون،۵/۳۵۹، ط: رشیدیہ)

۳:.....مردوں کے لیے بلاضرورت چاندی کی انگوٹھی پہننا مناسب نہیں، اگر کوئی پہنتا ہے تو اس کا وزن ایک مثقال (4.5 ماشہ یعنی 4.37 گرام) سے زائد نہ ہو، سیدھے اور الٹے دونوں ہاتھوں میں پہن سکتے ہیں، لیکن سیدھے ہاتھ کی چھوٹی انگلی میں پہننا زیادہ بہتر ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

’’إنما یسن التختم بالفضة من یحتاج إلی الختم کسلطان أوقاض أو نحوه وعند عدم الحاجة الترک أفضل، کذا فی التمرتاشی‘‘۔

(الفتاویٰ الهندیة، کتاب الکراهیة، الباب العاشر،۵/۳۳۵، ط: رشیدیہ)

مرقاۃ المفاتیح میں ہے:

’’وقد أجمعوا علی جواز التختم فی الیمنیٰ وعلی جوازه فی الیسریٰ، واختلفوا فی أیهما أفضل، والصحیح فی مذهبنا أن الیمین أفضل، لأنه زینةٌ والیمین أشرف وأحق بالزینة والإکرام...... فیثبت ندبه فی الخنصر

وإليه جنح الشافعية والحنفية''۔ (مرقاۃ المفاتیح، کتاب اللباس، باب الخاتم، ۲۷۵/۸، ط: مکتبہ امدادیہ)

''البحر الرائق'' میں ہے:

''ولایزید وزنه علی مثقال، لقوله –علیه الصلاة والسلام–: اتخذه من ورق، ولاتزده علی مثقال''۔ (البحر الرائق، کتاب الکراہیۃ، فصل فی اللبس، ۱۹۱/۸، ط: سعید)

فقط واللہ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح	کتبہ
ابوبکر سعید الرحمٰن	محمد انعام الحق	شعیب عالم	محمد عمران ممتاز
			متخصص فقہ اسلامی

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

نَقدُ و نَظَر

تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخوں کا آنا ضروری ہے

ادارہ

فہم رمضان کورس

مفتی منیر احمد۔صفحات: ۱۶۲۔ قیمت: درج نہیں۔ ملنے کا پتہ: دارالکتب متصل جامع مسجد الفلاح، بلاک: ایچ، شمالی ناظم آباد کراچی۔

زیرتبصرہ کتاب ''فہم رمضان کورس'' میں پانچ مضامین: استقبال رمضان، حقوقِ رمضان، اعمالِ رمضان، مسائل رمضان اور عید پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے اور ہر بات کو مدلل بیان کیا گیا ہے۔ ہر مضمون کے آخر میں مشق کے عنوان سے سوال و جواب کے لیے عبارت لکھی گئی ہے، جس کے حل کرنے سے ہی پڑھی گئی عبارت اور مطالعہ کے صحیح یا غلط ہونے کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ائمہ وخطباً اس کتاب سے کچھ نہ کچھ مسجد میں پڑھ کر سنادیا کریں تو رمضان کے متعلق مسائل وفضائل کا ایک معتد بہ ذخیرہ اپنے مقتدیوں اور نمازیوں کو پہنچا سکتے ہیں، جس سے سامعین کو ان شاء اللہ بہت فائدہ ہونے کا یقین ہے۔ کتاب کا کاغذ اس کتاب کے شایانِ شان نہیں۔حوالہ جات میں بھی محض کتاب کا نام لکھا گیا ہے، جلد نمبر اور صفحہ نمبر لکھنے کا تکلف نہیں فرمایا گیا۔امید ہے کہ اگلے ایڈیشن میں اس کمی کو پورا کردیا جائے گا۔

الشرح الثمیری علی المختصر القدوری

حضرت مولانا ثمیر الدین قاسمی دامت برکاتہم۔صفحات جلد اول: ۴۸۸، جلد دوم: ۴۵۲، جلد سوم: ۴۴۲، جلد چہارم: ۴۷۶۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: ختم نبوت اکیڈمی، ۳۸۷ کھتیانی روڈ فورسٹ گیٹ لندن۔ پاکستان میں ملنے کا پتہ: اسلامی کتب خانہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا اولادِ آدم پر بڑا فضل وکرم اور احسان ہے کہ ان کی ہدایت وراہنمائی کے لیے قرآن کریم جیسی لاریب کتاب اتاری، حضور اکرم ﷺ جیسی ذات کو ہادی وراہنما بنا کر تمام انبیاء کے آخر میں مبعوث فرمایا، پھر آپ ﷺ کی امت میں سے ایسے رجال اور افراد کو منتخب کیا گیا کہ جنہوں نے قرآن کریم اور حدیث نبوی کی مختلف انواع اور مختلف جہات سے خدمت کی۔بعض

نے الفاظ قرآن کے اعتبار سے خدمت کی، بعض نے کتاب کے معانی کے اعتبار سے خدمت کی اور بعض نے حدیث کے الفاظ، بعض نے حدیث کی سند اور بعض نے قرآن وسنت سے مسائل کا استنباط واستخراج کر کے امت کے سامنے فقہ کی صورت میں پیش کر دیا اور یہی فقہاء ہی ہیں جنہوں نے قرآن وحدیث کو صحیح معنوں میں سمجھا ہے، جیسا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے ''سنن الترمذی، أبواب الجنائز، باب في غسل الميت'' میں حدیث نقل کرنے کے بعد فقہی مذاہب کی روشنی میں حدیث کی توجیہ بیان کرتے ہوئے لکھا کہ: ''وکذٰلک الفقهاء وهم أعلم بمعاني الحديث''۔ (سنن ترمذی، ج:۱، ص:۱۹۳، ط: قدیمی کتب خانہ کراچی) ...... کہ ''فقہاء نے اسی طرح کہا ہے اور وہ حدیث کے معانی کو خوب جانتے ہیں''۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ قرآن وسنت کی جتنی خدمت فقہاء نے کی ہے، وہ کسی اور کے حصہ میں نہیں آئی۔ علم فقہ کے سرخیل اور قائد امام ابوحنیفہؒ ہیں، جن کی طرف فقہ حنفی منسوب ہے۔ مدارس کے نصاب میں فقہ حنفی کی ابتدائی کتاب ''مختصر القدوری'' شامل ہے، جس کی تشریح، توضیح اور تسہیل کے لیے بہت ساری کتب اپنا آپ منوا چکی ہیں۔ یہ زیرتبصرہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، جس میں درج ذیل خصوصیات کے ساتھ اس کتاب کو مرتب کیا گیا ہے:

۱: ...... ہر مسئلہ کو الگ الگ لکھا گیا ہے اور اس پر نمبر ڈال دیا گیا ہے، تاکہ مسئلہ سمجھنے اور نکالنے میں آسانی ہو۔ ۲: ...... ہر مسئلہ کا بامحاورہ ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ ۳: ...... ہر مسئلہ کی وجہ یعنی دلیل عقلی اور دلیل نقلی پیش کی گئی ہے۔ ۴: ...... ہر مسئلہ کے تحت احادیث کا ذخیرہ پیش کیا گیا ہے، تاکہ ہر ہر مسئلہ کو احادیث سے نکالنے میں آسانی ہو۔ ۵: ...... کونسا مسئلہ کس اصول پر فٹ ہوتا ہے؟ وہ اصول بیان کیا گیا ہے۔ ۶: ...... لغت کے تحت مشکل الفاظ کی تحقیق پیش کی گئی ہے۔ ۷: ...... فائدہ کے تحت ائمہ کرامؒ کا اختلاف مختصر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ۸: ...... تشریح کے تحت پیچیدہ مسئلہ کو سہل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ۹: ...... دلیل وغیرہ کو بہت طول نہیں دیا گیا ہے، تاکہ طلباً تنگ نہ آجائیں۔ ۱۰: ...... زبان سلیس اور آسان استعمال کی گئی ہے۔ ۱۱: ...... دلیل اور اصول وغیرہ ہدایہ اور صحاح ستہ جیسی اہم کتابوں سے لیے گئے ہیں۔ ۱۲: ...... وراثت کے مسئلے کو کیلکو لیٹر کی مدد سے نئے انداز میں سیٹ کیا ہے، جس سے پورا مناسخہ دومنٹ میں حل ہو جاتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ جزائے خیر دے ختم نبوت اکیڈمی کے کارپردازان خصوصاً مولانا سہیل باوا صاحب کو، جن کے اہتمام سے یہ کتاب اپنے شایانِ شان زیورطبع سے آراستہ ہوکر علمی حلقوں میں اپنی جگہ اور اپنا مقام بنا چکی ہے۔ مناسب ہوتا اگر اس کتاب کی کمپوزنگ، جلد بندی اور کاغذ میں تھوڑی اور محنت کی جاتی۔ اسی طرح کتاب کے اندر حوالہ جات کو نستعلیق کی بجائے نسخ میں ہی لکھا جاتا تو پڑھنے میں اور آسانی ہو جاتی۔ بہرحال کتاب معنوی اعتبار سے خوب سے خوب تر ہے۔